جہاں کا ذرہ ذرہ، درسِ خونخواری سکھاتا ہے — جہاں حیران ہے یزداں اور شیطاں مسکراتا ہے
جہاں حیوانیت ہر وقت مسرورِ بغاوت ہے — یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے

اختر شیرانی کی نظموں کے موضوعات کافی وسیع ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی موضوعات کے ساتھ ساتھ وہ تاریخی، سماجی اور اصلاحی موضوعات پر بھی نظمیں پیش کرتے ہیں۔

24.5.2 تاریخی، سماجی اور اصلاحی نظمیں

اختر شیرانی نے مے نوشی کے ذریعے اپنی زندگی کو بے اعتدالی کی ڈگر پر ڈال تو دیا لیکن ان کی شاعری میں جدید فیشن، رقص وسرود کی محفلوں اور عریانیت کے خلاف صدائے احتجاج ضرور بلند ہوتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے تاریخی اور سماجی ورثے پر وہ فخر کرتے اور سماج میں اصلاح کے خواہاں ہیں۔ ان کے تاریخی، سماجی اور اصلاحی شعور کی نمائندہ ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:

کفر ہے برسر پرخاش پھر ایمانوں سے — اے صبا کہنا! علی گڑھ کے غزل خوانوں سے
کہہ دو دنیائے سیاست کے صنم خانوں سے — چھیڑ اچھی نہیں اللہ کے دیوانوں سے
چھین لو شمع ستاروں کے شبستانوں سے — اور گزر جاؤ مہ و مہر کے ایوانوں سے
دور ہے منزلِ سلمائے حیاتِ جاوید — اور گزرنا ہے تمہیں موت کے ویرانوں سے
عمل و علم سے قائم ہے نظامِ اسلام — یہ نہ ترکوں سے، نہ عربوں سے افغانوں سے

اختر شیرانی کی شاعری میں اسلام کے ماضی کی تاریخ کے دھندلکے روشن ہوتے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک حریت پسند شاعر ہیں۔ اسلامی تاریخ کے صفحات الٹتے ہوئے اختر شیرانی نے معاشرے کے بدنما داغ کو بھی دھونے کی کوشش کی ہے۔ وہ امیر وغریب کے فرق کو مٹانے کے علمبردار ہیں۔ وہ مزدور، کسان اور محنت کش کے بڑے حامی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دنیا کا ہر آرام امیروں کے لیے ہے — پھر کون سی شے ہے جو فقیروں کے لیے ہے
بدبخت مریدوں پہ بھی یا رب نگہِ لطف — مانا کہ جو نعمت ہے وہ پیروں کے لیے ہے
ایک سیٹھ نے گندم کی یہ تعریف نئی کی — کھانے کے لیے کب ہے ذخیروں کے لیے ہے

حیات انسانی کو سنوارنے میں مزدور، محنت کش اور کسان کے حصے کو قبول کرتے ہوئے اختر شیرانی نے اپنی نظم ''کسان'' میں کسانوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مادیت کے عروج اور روحانیت کے زوال سے اعلیٰ انسانی اوصاف کی پامالی پر افسوس بھی اختر شیرانی کی نظموں میں موجود ہے۔ وہ روزمرہ زندگی، دفاتر، بازاروں، عبادت گاہوں اور درس گاہوں میں جس کمی کو محسوس کرتے ہیں، ان کا ذکر ملاحظہ ہو:

خلوص و اعتقاد و حسنِ نیت جس کو کہتے ہیں — بسنتی لال میں باقی، نہ شبراتی میں باقی ہے
بتاتی ہے یہ کثرت ہوٹلوں کی آج شہروں میں — کہ مہمانی کا جذبہ صرف دیہاتی میں باقی ہے
حق ہمسایہ کا پاس اگلے وقتوں کا جو زیور تھا — نہ اب بدھ سنگھ میں ہے نے جمعراتی میں باقی ہے

اس نظم میں اختر شیرانی کے اصلاحی جذبے کی نمائندگی ہوتی ہے اور یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ مادیت کے عروج سے کس طرح روحانی جذبے پس پشت ڈالے جا رہے ہیں۔

24.5.3 قومی وسیاسی نظمیں

وہ جہاں مذہبی اور اخلاقی موضوعات کا اپنی شاعری میں احاطہ کرتے ہیں، وہیں تاریخی، سماجی اور اصلاحی موضوعات کے ساتھ قومی اور سیاسی

موضوعات کی جھلک بھی ان کی شاعری میں جگہ بنالیتی ہے۔قومی نظریے اور ملکی سیاست پر ان کی نظموں سے چند اقتباسات پیش ہیں۔نظم ''آزادی'' کا یہ بند دیکھیے:

پکارتی ہے ہمالہ کی رفعتِ آزاد — کہ ہے ستاروں کا ہمسر مقامِ آزادی
چلی نسیم ' اٹھیں نکہتیں ' اڑے طائر — چمن میں دیکھے کوئی اہتمامِ آزادی
سبق یہ ملتا ہے دریاؤں کی روانی سے — جہاں میں کوئی نہ ہو تشنہ کام آزادی

اختر شیرانی کی قومی نظموں میں جہاں آزادی اور آزادی کے لیے جانبازی کا جذبہ نظر آتا ہے وہیں فوجی سپاہیوں کی دلیری اور حوصلہ مندی کی ستائش بھی موجود ہے۔

اختر شیرانی نے جنگ کے موضوع پر کئی نظمیں لکھیں ہیں ''ایک جنگی ترانہ''۔''وطن کے شہیدانِ جنگ''۔''موسم بہار''۔''نعم البدل'' اور ''دلیرانِ وطن کے نام'' جیسی نظمیں اختر شیرانی کی دلی آرزو کی نمائندہ ہیں۔حبِ وطن کا جذبہ ان کی شاعری میں حصول لذت دکھاتا ہے۔

ہندوستان کے بعض مقامات پر نیم فوجی جماعتوں نے اختر شیرانی کے ایک ترانے کو اپنا لیا تھا۔ترانے کے دو بند بطور مثال پیش ہیں:

دلاورانِ تیغ زن ' بڑھے چلو ' بڑھے چلو — بہادرانِ صف شکن ' بڑھے چلو ' بڑھے چلو
بلانِ زلزلہ فگن ' بڑھے چلو ' بڑھے چلو — غضنفرانِ پیل تن ' بڑھے چلو ' بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو ' بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن بڑھے چلو ' بڑھے چلو

سنو ' سنو کہ وقت کا کچھ اور ہی پیام ہے — بڑھو بڑھو کہ غازیوں کو بڑھنے ہی سے کام ہے
اٹھو اٹھو کہ خطرے میں وطن کا ننگ و نام ہے — برنگ جہلم و جمن ' بڑھے چلو ' بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن ' بڑھے چلو ' بڑھے چلو

اختر شیرانی کے کلام میں قومی و سیاسی نظموں کی کمی نہیں۔جس میں ان کی وطنی جذبے کی نمائندگی ہوتی ہے اور وہ اپنی نظموں کے ذریعے ملک و قوم میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔اس لیے ان کی نظموں کے مخاطب کسان' مزدور' سپاہی اور محنت کش ہی نہیں بلکہ ملک کے تمام انسان ہیں

24.5.4 بچوں اور عورتوں کے لیے نظمیں

اختر شیرانی نے اپنی شاعری میں ہمہ جہت موضوعات کا احاطہ کیا۔انھوں نے بچوں اور خواتین کے لیے بھی نظمیں تحریر کیں۔ان کی نظمیں ''شریر لڑکا''۔''قانون کی عزت'' اور ''اس سے کہہ دوں گا'' بچوں کے لیے بڑی سبق آموز ہیں جن میں مناظر فطرت کی عکاسی کے علاوہ بچوں کی فطرت کی موثر نمائندگی بھی دکھائی دیتی ہے۔

ان کے شعری مجموعہ ''نغمہ حرم'' میں بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی نظمیں موجود ہیں ایسی نظموں میں۔''ایک لڑکی کا گیت''۔ ''باغوں کی بہاریں'' اور ''پھول کے گیت'' شامل ہیں۔بچوں کے گیت میں اختر شیرانی موسم بہار کی رنگینیو اور اس کی مست کر دینے والی فضاؤں کے علاوہ جھولے کی تعریف کرتے ہیں۔ایک لڑکی کی آرزو کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

جہاں اونچے پہاڑوں پر گھٹائیں گھر کے آتی ہوں
ہوا کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہوں

وہاں میں ہوں' مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

انھوں نے خواتین کے لیے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ نظم ''بلاوا'' میں نسوانی جذبات کی عکاسی صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ''طیورۂ آوارہ'' میں شامل ان کے گیت ''پی کی یاد میں'' عورت کی بے قراریوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

انھیں جی سے میں کیسے بھلادوں سکھی، مرے جی کو جو آ کے لبھا ہی گئے
مرے من میں وہ پریم بسا ہی گئے، مجھے پریت کا روگ لگا ہی گئے

اختر شیرانی کی نظموں میں دکھ سکھ کی نمائندگی اور خواتین کے جذبات اور احساسات کی خوبصورت پیش کشی موجود ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اختر شیرانی کی مذہبی اور اخلاقی نظموں کا جائزہ لیجیے۔
2. اختر شیرانی نے تاریخی، موضوعاتی اور اصلاحی نظمیں کس انداز سے لکھی ہیں۔
3. اختر شیرانی کی قومی و سیاسی نظموں کا احاطہ کیجیے۔
4. بچوں اور عورتوں کی نظموں میں اختر شیرانی کے انداز کا جائزہ لیجیے۔

24.6 اختر شیرانی کی نظموں کا فنی جائزہ

اختر شیرانی ایک باشعور نظم نگار ہیں۔ انھوں نے شوقیہ یا دل کے بہلانے کے لیے نظم نگاری کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ اپنے شوق و ذوق سے نظم کا انتخاب کیا۔ ان کے یہاں موضوعاتی نظموں کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ انہوں نے گیت، سانیٹ اور ماہیے بھی لکھیے۔ نظم کی تکنیک اور اس کے انداز بیان میں اختر شیرانی نے کئی تجربے کیے جو نہ صرف کامیاب بلکہ اردو دنیا کے لیے قابل قبول رہے۔ اختر شیرانی کی نظمیں جمالیات پرستی اور فطرت پرستی کی مظہر ہیں۔ لفظوں کی سادگی اور سلاست نے ترنم پیدا کر دیا ہے صنائع و بدائع کی تلاش ان کی نظموں میں سعی حاصل ہے۔

24.6.1 اختر شیرانی کی جمالیات پرستی

اختر شیرانی کے عہد میں ترقی پسند تحریک کو عروج حاصل ہو چکا تھا اور حقیقت پسندی کا رجحان پروان چڑھنے لگا تھا۔ اردو کے بیشتر شعرا نے ادب برائے زندگی اور حقیقت پسندی کو شعری وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ اختر شیرانی بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے لیکن انھوں نے ترقی پسندی اور حقیقت پرستی کے بجائے جمالیات پرستی، رومانیت اور حسن آفرینی کو اپنی نظموں میں شامل کیا۔ وہ اپنی ہر نظم کو حسن اور وارفتگی کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔ اختر شیرانی کی جمالیات پرستی میں ناکامی اور نامرادی کا کوئی دخل نہیں۔ وہ جس چیز کو چاہتے ہیں۔ اسے ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ حسن و جمال اور وارفتگی کے ساتھ والہانہ پن کو شاعری میں جگہ دے کر حسن پیدا کرنا اختر شیرانی کی شاعری کا کمال ہے۔ انھوں نے ہر چیز میں پوشیدہ حسن کو نمایاں کرنے کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ ان کی شاعری میں جمالیات پرستی ہر منظر کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

''بنگال کی ایک شام'' کی رعنائی کو اختر شیرانی نے جس حسن کاری اور جمالیاتی خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ اس کا انداز ملاحظہ ہو:

گنگناتی ہوئی، ہنستی ہوئی اٹھلاتی ہوئی — شامِ بنگال اٹھی، زلفوں کو لہراتی ہوئی
چشم میگوں میں لیے خواب زلیخا کا ہجوم — چاک دامانی یوسف کی قسم کھاتی ہوئی
بھر کے دامن میں حسینوں کا مہکتا ہوا نور — قصۂ طور کو ہر گام پہ دہراتی ہوئی
سارے خم بھول کے اک عالم سرمستی میں — قہقہہ بن کے ہر ایک ہونٹ پہ لہراتی ہوئی

موسم بہار کی فطرت کی سرگرمیوں کو اختر شیرانی نے وجد آفرینی اور مستی آفرین انداز میں نظم کیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

تب وادی کی کمسن کلیوں تک، زہرہ کی شعاعیں آتی ہیں
اوران کے رنگ و بو کے رسیلے پردوں میں بس جاتی ہیں
اور شبنم بوسے لیتی ہے، مستی کی بہاریں چھاتی ہیں
اور ماہ و شانِ کاہ کشاں، گل ہائے طلا برساتی ہیں
جس وقت یہ سب رنگینیاں، اس وادی میں یکجا ہوتی ہیں
تب کلیوں کے رنگیں پہلو سے کچھ حوریں پیدا ہوتی ہیں

جنگل کے ایک سنسان منظر کے حسن کو بیان کرنے کے لیے اختر شیرانی نے خیال کو جس وجد اور کیف آفریں فضا میں پہنچا دیا ہے، اس کی دلکشی کا جمالیاتی انداز ملاحظہ ہو:

فرشِ زمردیں پر کچھ پھول سو رہے ہیں — نغمے کے پر کی جنبش، جن کو جگا رہی ہے
جنگل مہک رہا ہے، کلیاں چٹک رہی ہیں — ہر تان میں الہٰی، کیا گل کھلا رہی ہے
وادی میں موجزن ہے، نغموں کا کیف لرزاں — ہر پھول، ہر کلی پر، مستی سی چھا رہی ہے
اک نہر بہ رہی ہے، تھوڑے سے فاصلے پر — گاتی ہوئی جو اپنی، منزل کو جاری ہے
یا جل پری روپہلی، موجوں کے بربطوں پر — تاروں کے دیوتا کو، نغمے سنا رہی ہے
وہ دیکھو کوئی جوگن، جنگل میں گا رہی ہے

24.6.2 اختر شیرانی کی فطرت پرستی

مناظر قدرت پر بھی ان کی بے شمار نظمیں ان کی فطرت پرستی کی مظہر ہیں۔ برکھارت۔ جشن بہار، آمد بہار، نغمہ بہار، ابر سے، ترانہ بہار، طلوع بہار، ماتم بہار اور فروغ سحر ایسی نظمیں ہیں جن سے ان کی فطرت پرستی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے:

پھرتی ہیں آوارہ و متوالی گھٹائیں اس طرح — اور ہوائیں اس طرح
جھومتا پھرتا ہو جیسے میگساروں کا ہجوم — بادہ خواروں کا ہجوم
یہ گھٹائیں ہیں کہ خوابوں کے سفینے ہیں رواں — بے قرینے ہیں رواں
بادبانوں میں چھپائے چشمہ ساروں کا ہجوم — جوئباروں کا ہجوم
یوں نظر آتے ہیں کوہسارِ مسوری دور سے — مست سے مخمور سے
جوں سمندر سے جزیروں کے قطاروں کا ہجوم — سبزہ زاروں کا ہجوم

فطرت کی مشاطگی کو مزید دلفریب بنانے میں اختر شیرانی کی تشبیہات اور استعارے اپنی حسن آفرینی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کی نظم ''وادیٔ گنگا'' میں شامل فطرت پرستی کا نکھار ملاحظہ ہو:

یہ تارے ہیں یا نور کے پیمانے ہیں روشن
معصوم پری زادوں کے کاشانے ہیں روشن
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں روشن
یا دامنِ افلاک میں بے باک شرارے

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے کنارے

نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' کے اکثر بند میں اختر شیرانی نے فطری منظر کشی کو نمایاں کیا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ حسن پرستی اور فطرت پرستی کا انوکھا انداز اختر شیرانی کی نظموں میں امڈ پڑتا ہے۔ وہ ہر شے میں موجود حسن کو شعری سلیقے کے ساتھ نمایاں کرنے میں بڑا کمال رکھتے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز کی منظر کشی کی کے لیے اپنے کلام میں الفاظ کا ایسا نادر ذخیرہ رکھتے ہیں کہ جس کے ذریعے قوت بیان کے تمام وسائل ان کی شاعری میں اپنے جوہر دکھانے لگتے ہیں۔

24.6.3 اختر شیرانی کی نظموں کی لفظیات

مترنم لفظیات اور جمالیاتی خصوصیات کی حامل لفظیات کو شاعری میں جگہ دینا اختر شیرانی کا وصف ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں سادہ اور عام فہم الفاظ کو جگہ دی ہے۔ الفاظ کی نشست سے معنویت پیدا کرنے اور کیف پرور ماحول پیدا کرنے کا فن اختر شیرانی کو خوب آتا ہے۔ جمالیات اور حسن آفرینی کے ذریعے رومانویت کا حق ادا کرنے کے لیے وہ تراکیب لفظی پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ طویل فارسی اور عربی تراکیب سے وہ اجتناب کرتے ہیں اور موزونیت کے اعتبار سے ہندی اور سنسکرت الفاظ کے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی شعریات میں حسن کا سرور اور عشق کا کیف پایا جاتا ہے۔ بے تکلفی اور بے باکی ان کی شاعری میں امڈ پڑتی ہے۔ سادہ لفظیات کے ذریعہ وہ اپنی شاعری کی کائنات سجاتے ہیں۔ پرشکوہ اور پیچیدہ تراکیب سے گریز ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ یہی انداز ان کی شاعری کو انفرادیت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

24.6.4 اختر شیرانی کی نظموں کی ہیئت

اختر شیرانی نے غزل کے بانکپن کی طرح نظم کو تمام فنی اور تکنیکی خصوصیات سے وابستہ کر دیا ہے جس میں رومانی رویے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پابند نظم کے انداز کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اختر شیرانی نے اپنی نظم کے لیے نئی نئی ہئیتیں استعمال کی ہیں۔ اپنی نظموں میں مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کے علاوہ خالص گیت کے طرز کو بھی اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ان کی نظمیں مختلف ہیئتوں میں نظر آتی ہیں۔ بعض نظموں میں وہ دو اور تین مکمل مصرعوں کے بعد دو مختصر مصرعوں کے ذریعے نظم کی ہئیت کا تعین کرتے ہیں۔ ان کی نظم ''اے عشق کہیں لے چل'' تین مکمل مصرعوں کے بعد دو مختصر مصرعوں کے ذریعہ تشکیل پاتی ہے۔ ان کی مشہور زمانہ نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' کی تشکیل پہلے ایک مصرعہ کے بعد تین مصرعے اور پھر پہلے مصرعہ کو بار بار دہرانے کی تکنیک سے ہوئی۔ ان کی مشہور نظم ''آخری امید'' میں ہر بند تین مصرعوں پر مشتمل ہے جس کے بعد دو مختصر مصرعوں کی تکرار سے نظم کے حسن کو دوبالا کیا گیا ہے۔ اردو نظم میں اس قسم کے ہئیت کے تجربے سب سے پہلی بار اختر شیرانی کے کلام میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ عام انداز سے غزل اور بند کی بنیاد پر بھی نظمیں تحریر کرتے ہیں لیکن نظم کے ہیئتی ڈھانچے کو پیش کرنے کے معاملہ میں وہ جدت پسند واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی اور حالی کی روایتوں سے ضرور فائدہ اٹھایا اور ان کی اختیار کردہ ہئیت کو فروغ دیتے ہوئے اردو نظم کو پابند نظم کی جکڑ بندیوں سے نکال کر گیت اور جدید نظم کی ڈگر پر لا کھڑا کیا۔ اختر شیرانی نے اگرچہ نظم نگاری کے دوران قافیہ، ردیف، وزن، بحر اور علم عروض کی مکمل پابندی بھی کی ہے لیکن نظم کی ساخت میں تبدیلی لا کر اپنے انفرادی انداز کی بنیاد رکھی ہے۔

24.6.5 ماہیا

نظم کی شاعری کو جدت پسندی اور نئے نئے تشکیلی عناصر سے وابستہ کر کے اس صنف میں اجتہادی رویہ اختیار کرنا اختر شیرانی کا مقصد رہا۔ چنانچہ انھوں نے جہاں انگریز صنف نظم ''سانیٹ'' کو اردو شاعری میں فروغ دیا وہیں پنجابی شاعری کی صنف ''ماہیا'' کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ماہیا پنجاب کا مقبول ترین عوامی گیت ہے۔ اردو، فارسی، عربی یا ہندی کی کوئی بھی صنف شاعری اس سے مماثلت نہیں رکھتی۔ البتہ اردو غزل، مستزاد اور گیت کی یہ ملی جلی

شکل کہی جاسکتی ہے: جس کا بنیادی موضوع حسن وعشق ہے۔ اختر شیرانی کی نظموں میں اس صنف کی پذیرائی موجود ہے۔ تین تین مصرعوں کے ماہیے ہیں وہ سوالات پیش کرتے ہیں:

وہ جب کبھی یاد آتے ہیں
کیوں چھیڑے ہیں مجھ کو
کیوں مجھ کو ستاتے ہیں

چپ چپ سے وہ رہ رہ کر
کچھ آنکھوں میں کہہ کہہ کر
کیوں مجھ کو ستاتے ہیں

اختر شیرانی کے ماہیوں میں کم از کم چار اور زیادہ سے زیادہ چھ مصرعوں کا انداز نمایاں ہے جس میں عمومیت اور سادگی موجود ہے۔

دل ہم کو لٹا بیٹھا
ہم دل کو لٹا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

مٹ جائے یہ سینے سے
اس عشق میں جینے سے
ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

دم عشق کا بھرتے ہیں
ہم یاد انھیں کرتے ہیں
وہ ہم کو بھلا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

لکھا تھا یہ قسمت میں
آخر کو محبت میں
ہم جان گنوا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

.....

غم خانۂ ہستی میں
اس خواب کی بستی میں
جو چیز ہے فانی ہے
دو دن کی جوانی ہے

اک خواب شبانہ ہے
آہوں کا فسانہ ہے
اشکوں کی روانی ہے
دو دن کی جوانی ہے

اختر شیرانی نے ماہیا کے انداز پر نظمیں لکھیں۔ ماہیا کے علاوہ گیت کے ذریعے بھی نظم نگاری کو اظہار کا ذریعہ بناتے ہوئے انھوں نے اجتہاد اور جدت کے دروازے کھلے رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اختر شیرانی کی نظموں میں کئی ندرتیں دکھائی دیتی ہیں۔

24.6.6 گیت

گیت کی کوئی ہیئت مقرر نہیں ہوتی بلکہ اس کا مدار بڑی حد تک موسیقی پر ہوتا ہے۔ دھن کے تقاضوں کے مطابق مصرعوں کی ترتیب اور الفاظ کی نشست و برخاست پر توجہ دی جاتی ہے۔ ہندی سے اردو میں پھلنے پھولنے والی اس صنف کو اختر شیرانی نے خاص طور پر اپنی نظموں میں استعمال کیا چنانچہ ان کی شاعری بے شمار گیتوں سے مالا مال ہے۔ ان کے گیت کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

ہم پریم پجاری ہیں، تو پریم کنہیا ہے
تو پریم کنہیا ہے، یہ پریم کی نیا ہے
یہ پریم کی نیا ہے، تو اس کا کھویا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اختر شیرانی نے مستزاد کے طرز پر کئی گیت لکھے ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

لیلیٰ شب کے پریشاں ہیں گیسوے سیاہ — شورش آباد جہاں تیرہ و تار
نشہ برساتی ہے، مدہوش ستاروں کی نگاہ — نیند میں غرق ہے سارا سنسار
چار سو چھا گئی، خاموشی و ظلمت کی سیاہ — نور و آہنگ نے لی راہِ فرار
نیند کی سیج سے جاگ اٹھا ہے خوابیدہ گناہ — شیر خونخوار ہو جیسے بیدار

.....

القصہ فلسفۂ ذوقِ جوانی یہ ہے — کہ جوانی نہ لٹائی جائے
مئہ پارینہ کی خوبی کی نشانی یہ ہے — مدتوں تک وہ چھپائی جائے
عفت اور اس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے — شاعروں کو نہ سنائی جائے
مذہب شعر کی الہام فسانی یہ ہے — معصیت خوب بڑھائی جائے

اس طرح اختر شیرانی نے نظم کے علاوہ ماہیا اور گیت میں جوہر دکھائے اور ثابت کیا کہ ان کا ذہن ہر خیال کو نظم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اختر شیرانی کس قسم کی لفظیات پر توجہ دیتے ہیں؟
2. اختر شیرانی کی نظموں کی ہیئت کیا ہے؟
3. اختر شیرانی کے گیتوں کی خصوصیات کیا ہیں؟
4. اختر شیرانی نے ماہیا کا استعمال کس طرح کیا ہے؟

24.7 نظم اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے، لعنت گہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے اس نفس پرستی سے
دور ..... اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ہم پریم پجاری ہیں تُو پریم کنہیا ہے !
تو پریم کنہیا ہے، یہ پریم کی نیا ہے !
یہ پریم کی نیا ہے تو اس کا کھوّیا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

یہ درد بھری دنیا بستی ہے گناہوں کی !
دل چاک اُمیدوں کی، سفاک نگاہوں کی !
ظلموں کی، جفاؤں کی، آہوں کی، کراہوں کی !
ہیں غم سے حزیں ۔ لے چل
اے عشق کہیں لے چل

قدرت ہو حمایت پر، ہمدرد ہو قسمت بھی
سلمٰی بھی ہو پہلو میں، سلمٰی کی محبت بھی
ہر شے سے فراغت ہو اور تیری عنایت بھی
اے طفل حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

سنسار کے اُس پار اک اس طرح کی بستی ہو
جو صدیوں سے انسان کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے نظاروں پر تنہائی برستی ہو
یوں ہوتو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک ایسی جگہ جس میں انسان نہ بستے ہوں
یہ مکر و جفا پیشہ حیوان نہ بستے ہوں
انساں کی قبا میں یہ شیطان نہ بستے ہوں
تو خوف نہیں، لے چل
اے عشق کہیں لے چل

برسات کی متوالی گھنگور گھٹاؤں میں
کہسار کے دامن کی مستانہ ہواؤں میں
یا چاندنی راتوں کی شفاف فضاؤں میں
اے زُہرہ جبیں ، لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ان چاندستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی نہروں میں
ٹھہری ہوئی نہروں میں سوئی ہوئی نہروں میں
اے خضر حسیں ، لے چل
اے عشق کہیں لے چل

24.7.1 نظم ''اے عشق کہیں لے چل'' کا تجزیہ

اختر شیرانی کی رومانوی نظموں میں عشق کی گرمی اور اس کی بے تابی کو ظاہر کرنے والی ایک انفرادی نظم کی حیثیت سے ''اے عشق کہیں لے چل'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نظم مثلث کے سات بند پر مشتمل ہے اور نظم کا تمام تر نظام اس کے لفظوں کی بے ساختگی اور جذبہ کی فراوانی کی وجہ سے ایک کیف پرور ماحول سے معمور ہو جاتا ہے۔ عشق کو ایک جذبہ ہی نہیں بلکہ دنیا میں پلنے والے ایک قیمتی احساس کا درجہ دیتے ہوئے اختر شیرانی کہتے ہیں کہ دنیا گناہوں کی بستی ہے جہاں نفس پرست عشق کو پلنے دینا نہیں چاہتے۔ اس لیے نفرت کو پالنے والی اس دنیا سے نکل کر وہ ایک ایسی عشق کی دنیا میں بسیرا کرنا چاہتے ہیں جہاں محبت کی حکمرانی ہو اور جہاں کے نظارے انسان کی صورت کو ترستے ہوں۔ وہ ایک ایسی دنیا میں عشق کو لے جانا چاہتے ہیں جہاں انسان اور حیوان تو کیا شیطان کا وجود بھی نہ ہو اور اس بستی میں ہر وقت برسات کی متوالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں اور پہاڑ کے دامن میں مستانہ ہوائیں چلتی ہوں اور چاندنی رات، شفاف فضا کا ایک حسین نظارہ بن جائے۔ یہ جذبہ اختر شیرانی کو اس لیے دنیا سے دور لے جانے کے لیے مجبور کرتا ہے کہ انہوں نے دنیا میں بس کر دیکھ لیا ہے کہ اس دنیا میں ہر طرف نفرتیں ہیں۔ موقعہ پرستی اور نفس شعازی انسان کا مسلک بن گئی ہے۔ جہاں پر ہر وقت لعنت برستی ہے اور ساری دنیا درد سے بھری اور گناہوں اور کراہوں سے بھری ہوئی ہے اس لیے اس دنیا سے دور لے جانے کے لیے وہ عشق سے التجا کرتے ہیں۔ اس نئی عشق کی بسائی ہوئی دنیا میں پہنچنے کے بعد وہ قدرت کی حمایت اور قسمت کی ہمدردی کے علاوہ سلمٰی کی محبت اور ہر شئے سے فراغت کی دُعا کرتے ہوئے خدا سے عنایت کی التجا کرتے ہیں۔ ایک ایسی پاک وصاف بستی میں جا کر اپنے عشق کے ساتھ وہ آباد ہونا چاہتے ہیں جہاں کوئی فکر کوئی خوف نہ رہے وہ چاند تاروں سے بکھرے ہوئے شہروں میں نور کی ٹھہری ہوئی کرنوں سے معمور نہروں اور اس میں بسنے والے انسانوں سے بے حد خفا ہو کر حضرت خضر کو آواز دیتے ہیں کہ ایسی صاف و پاک بستی جہاں عشق ہی سب سے بڑا سرمایہ ہو ایسی دنیا سے شاید ہی خضر واقف ہوں اس لیے اختر شیرانی ان سے ایسی بستی میں لے جانے کی آرزو کرتے ہیں۔ پوری نظم بے ساختہ جذبات اور دلی احساسات سے اس قدر مالا مال ہے کہ نظم کا ہر لفظ اپنے اندر معنویت کی دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ ساری نظم تاثیر سے بھرپور ہے۔

رومانوی فضا تیار کرنے کا ایک انداز ایسا بھی ہوتا ہے جس کے ذریعہ کسی حقیقت کی نفی کر کے اثبات کا جواز پیدا کیا جائے۔ اختر شیرانی نے اپنی نظم ''اے عشق کہیں لے چل'' کو دنیا کی نفی اور عشق کی بستی کے اثبات کے ذریعہ نمایاں کیا ہے۔ وہ اپنے عشق کے ساتھ جس مقام پر رہائش اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ مقام درحقیقت ان کے خیالات کی ایسی رومانوی بستی ہے جس کا وجود صرف خیالی ہے۔ عشق کی یہ بستی دنیا کے اُس پار ایسی جگہ موجود ہے جہاں صدیوں سے کسی انسان کی صورت کا گزر نہ ہوا اور اس کے ہر نظارے پر تنہائی کی حکمرانی ہے اور اس سرزمین پر ہر قسم کی فراغت کا دور دورہ ہے۔ ایک ایسی دنیا کا تصور حقیقت میں ممکن نہیں لیکن شاعر کے خیال اور احساس کے ذریعہ ایسی دنیا کا تصور پیش کیا گیا ہے جو حقیقت سے بالاتر ہے اور رومانی احساس کی وجہ سے صرف خیالی دنیا کا درجہ رکھتا ہے۔

اردو کی رومانوی نظموں میں اختر شیرانی کی نظم ''اے عشق کہیں لے چل'' کو اس وجہ سے بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ یہ نظم جمالیاتی طور پر ہی نہیں

بلکہ احساساتی سطح پر بھی انسان کو ایک فرحت بخش ماحول فراہم کردیتی ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے ماحول سے اکتا جاتا ہے وہ کسی قسم کی تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔ نظم ''اے عشق کہیں لے چل'' میں آفات و بلائیات اور مصیبتوں سے بھری ہوئی دنیا سے خود کو الگ کرنے کا ایک قیمتی احساس نمایاں ہوتا ہے۔ اس نظم میں اختر شیرانی نے بے شمار ہندی کے سبک اور رواں الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ پاپ، پریم، پجاری، کنہیا، نیا، کھویا، گھنگھور، گھٹا جیسے الفاظ کو پوری نغمگی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ ہم قافیہ الفاظ جیسے بستی، ہستی، پرستی، ترستی اور برستی کے استعمال سے بھی نظم میں نغمگی کا احساس شدید ہوگیا ہے۔ مجہول جمع، گاہوں، نگاہوں، گھٹاؤں، ہواؤں، فضاؤں، کراہوں، جفاؤں کے علاوہ آہوں اور ظلموں کو بھی اختر شیرانی نے بڑی امتیازی خصوصیت کے ساتھ استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے نظم کے جمالیاتی احساسات میں کئی گناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ نظم کی صوتی خصوصیات کے ساتھ ساتھ نغمگی اور موسیقیت کے بھی کئی وسائل نظم میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ ہیئتی اعتبار سے بھی اختر شیرانی نے مصرعہ کے آدھے حصے کو ٹیپ کے مصرعہ کے طور پر استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے اس نظم میں گیت کا آہنگ پیدا ہوگیا ہے۔

24.8 نظم: اودیس سے آنے والے بتا (ایک نووارد ہموطن سے کسی غریب الوطن کا خطاب)

اودیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا — کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا ! — کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن ' فردوسِ وطن — وہ سروِ وطن ' ریحانِ وطن

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں — مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر — گھنگور گھٹائیں آتی ہیں ؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں — ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

شاداب و شگفتہ پھولوں سے — معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں
بازار میں مالن لاتی ہے — پھولوں کے کندھے ہار اب کہ نہیں
اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں — نو عمر خریدار اب کہ نہیں

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا شام پڑے گلیوں میں وہی — دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے ؟
اور سڑکوں کی دھندلی شمعوں پر — سایوں کا بسیرا ہوتا ہے؟
باغوں کی گھنیری شاخوں میں — کس طرح سویرا ہوتا ہے؟

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں ویسی ہی جواں — اور مدھ بھری راتیں ہوتی ہیں
کیا رات بھر اب بھی گیتوں کی — اور پیار کی باتیں ہوتی ہیں
وہ حسن کے جادو چلتے ہیں — وہ عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر — پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر — سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے — ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی فضا کے دامن پر — برکھا کے سمے لہراتے ہیں
کیا اب بھی کنار دریا پر — طوفان کے جھونکے آتے ہیں
کیا اب بھی اندھیری راتوں میں — ملاح ترانے گاتے ہیں

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں برسات کے دن — باغوں میں بہاریں آتی ہیں
معصوم و حسیں دوشیزائیں — برکھا کے ترانے گاتی ہیں
اور تیتریوں کی طرح سے رنگیں — جھولوں پر لہراتی ہیں

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں — احباب کنارِ دریا پر
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں — شاداب کنارِ دریا پر
اور پیار سے آ کر جھانکتا ہے — مہتاب کنارِ دریا پر

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا آم کے اونچے پیڑوں پر — اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں
شاخوں کے حریری پردوں میں — نغموں کے خزانے کھولتے ہیں
ساون کے رسیلے گیتوں سے — تالاب میں امرت گھولتے ہیں

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی کسی کے سینے میں　　باقی ہے ہماری چاہ بتا؟
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب　　یاروں میں کوئی آہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا　　للّٰہ بتا ۔ للّٰہ بتا؟

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا گاؤں میں اب بھی ویسی ہی　　مستی بھری راتیں آتی ہیں ؟
دیہات کی کم سن ماوشیں　　تالاب کی جانب جاتی ہیں ؟
اور چاند کی سادہ روشنی میں　　رنگین ترانے گاتی ہیں؟

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا گاؤں میں اب بھی ساون پر　　برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں؟
معصوم گھروں سے بھور بھے　　چکی کی صدائیں آتی ہیں؟
اور یاد میں اپنے میکے کی　　بچھڑی ہوئی گوپیاں گاتی ہیں؟

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

دریا کا وہ خواب آلودہ سا گھاٹ　　اوراس کی فضائیں کیسی ہیں؟
وہ گاؤں ' وہ منظر ' وہ تالاب　　اور اس کی ہوائیں کیسی ہیں؟
وہ کھیت ' وہ جنگل ' وہ چڑیاں　　اور اُن کی صدائیں کیسی ہیں؟

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا !　　وہ غارتِ ایماں کیسی ہے ؟
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی　　وہ آفتِ دوراں کیسی ہے ؟
ہم دونوں تھے جس کے پروانے　　وہ شمع شبستاں کیسی ہے ؟

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا　　وہ غنچہ دہن کس حال میں ہے ؟
جس پر تھے فدا طفلانِ وطن　　وہ جانِ وطن کس حال میں ہے؟
وہ سرو چمن وہ رشک سمن　　وہ سیم بدن کس حال میں ہے ؟

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی رُخ گلرنگ پہ وہ جنت کے نظارے روشن ہیں؟
کیا اب بھی رسیلی آنکھوں میں ساون کے ستارے روشن ہیں ؟
اور اُس کے گلابی ہونٹوں پر بجلی کے شرارے روشن ہیں؟

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا

اب نام خدا ہوگی وہ جواں میکے میں ہے یا سسرال گئی ؟
دوشیزہ ہے یا آفت میں اُسے کم بخت جوانی ڈال گئی؟
گھر پر ہی رہی ' یا گھر سے گئی خوشحال رہی ' خوشحال گئی؟

اودیس سے آنے والے بتا

24.8.1 نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' کا جائزہ

اردو کی وطنی شاعری میں مولانا حالی اور محمد حسین آزاد کے بعد برج نرائن چکبست کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کی نظموں کے ساتھ اختر شیرانی کی اس نظم کو وطنیت پرستی کی ایک اہم نظم کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس نظم میں اختر شیرانی نے کیفیاتی فضا باندھی ہے۔ یہ ترجیع بند کے فارم میں ہے جس میں چھ مصرعے ہیں۔ یہ نظم جملہ اٹھارہ بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند میں ایک کیفیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پہلے بند میں وطن کے باغوں' مستانہ ہواؤں' پہاڑوں کی گھنگھور گھٹاؤں اور برکھاؤں کا ذکر موجود ہے۔ دوسرے بند میں باغ کے شگفتہ پھولوں کا ذکر کیا گیا ہے تیسرے بند میں وطن کی گلیوں اور وہاں کی سڑکوں اور شاموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد چوتھے بند میں وطن کی راتوں اور گیتوں کی کیفیت کو نظم کیا گیا ہے۔ پانچویں بند میں وطن کے پن گھٹ اور اس کی حسیناؤں کے جھرمٹ کا ذکر کیا ہے جس کے بعد اختر شیرانی نے برسات' طوفان اور ملاح کے ترانوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات دریافت کی ہے کہ شام کے وقت لوگوں کا دریا کے کنارے جانا اور گھنیرے پیڑوں کے نیچے بیٹھ کر شادابی حاصل کرنا یہ تمام کیفیتیں اب بھی جاری ہیں یا نہیں؟ آم کے اونچے پیڑوں اور ان کی شاخوں پر پپیہوں کے نغموں کے علاوہ ساون کے رسیلے گیتوں کا ذکر کرتے ہوئے اختر شیرانی نے دریافت کیا ہے کہ وطن والوں کے دل میں کیا اب بھی وہی چاہت ہے اور کوئی یار دوست آہیں بھر کر ہمیں یاد کرنے والا موجود بھی ہے یا نہیں؟ گاؤں کی مستی بھری راتوں' تالاب کا منظر' رنگین ترانے اور چاند کی سادہ روشنی کا حوالہ دیتے ہوئے اختر شیرانی نے گاؤں کے ساون' برکھا کی بہاریں' چکی کی صدائیں اور مہکی ہوئی یادوں کا ذکر دلچسپ شاعرانہ پیرائے میں کیا ہے۔ اختر شیرانی نے گاؤں کے تالاب' گھاٹ' ہواؤں اور فضاؤں کے علاوہ کھیت' جنگل اور چڑیا کی صداؤں کے بارے میں موثر نمائندگی کی ہے نظم کے آخری حصے میں شوخ و چنچل حسیناؤں کی بات کرتے ہوئے اختر شیرانی نے یہ بات واضح کی ہے کہ میٹھے بول سنانے والی اس ملک میں کس حال میں ہے۔ چاند جیسا بدن جس پر چمن ناز کرتا ہو اس کا کیا حال ہے۔ اپنے وطن کے نظاروں کو جنت کے روشن نظاروں سے تعبیر کرتے ہوئے اختر شیرانی نے اپنے وطن کی لڑکیوں کی رسیلی آنکھوں اور گلابی ہونٹوں کی تعریف دل نشین انداز میں کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ جب روتی ہیں تو ساون کے ستارے روشن ہو جاتے ہیں اور جب وہ بات کرتی ہیں تو بجلی کے شرارے نمایاں ہو جاتے ہیں اور آخر میں اپنے وطن کی نوخیز لڑکیوں کے مائکہ میں رہنے یا سسرال چلے جانے کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ اختر شیرانی نے کسی دوشیزہ پر آنے والی جوانی کو ایک آفت قرار دیتے ہوئے یہ بھی دریافت کیا کہ کیا وہ گھر پر ہی رہی یا گھر سے چلی گئی۔ ہر دو حال میں وہ خوش حال بھی رہتی ہے یا خوش حال جاتی ہے۔ اپنے ان جذبات اور احساسات کے ذریعہ نظم لکھ کر اختر شیرانی نے اپنے وطن کی کیفیت دریافت کرنے کے دوران بھی جمالیات کا حسین تصور اُبھارا ہے اور مختلف منظروں کی نمائندگی یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اختر شیرانی نظم کے دوران رومانی فضا تیار کرنے میں بڑی قدرت رکھتے ہیں۔

اردو کے بیشتر شعرا نے وطنی شاعری میں اپنے وطن سے خطاب کیا ہے اور وطن کی بے شمار عمارتوں اور ان کی یادگاروں سے اپنی والہانہ محبت کو ظاہر کیا۔ اردو کے تمام وطنی شاعروں کے مقابلے میں اختر شیرانی کا شعری انداز جداگانہ ہے ان کی نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' ایک کامیاب وطنی نظم ہے۔ اس نظم میں رومانی اور جمالیاتی احساسات کو شامل کرتے ہوئے اختر شیرانی نے کیف پرور فضا تیار کی ہے۔ ان مناظر کی نشاندہی نظم کا خاصہ ہے جو حسن و

عشق کے آئینہ دار یا فطری مناظر کے امین ہیں۔ گاؤں۔ پنگھٹ' ہوائیں' فضائیں' کھیت' جنگل' ساون اور بہار کے ذکر کے ساتھ ایک حسین دوشیزہ کا تصور بھی اس نظم میں نمایاں ہوتا ہے اور اس دوشیزہ کے حسن پر نکھار آنے والے مناظر کو بھی اختر شیرانی نظم کا حصہ بنا لیتے ہیں اس لیے یہ نظم وطنی شاعری سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ رومانی احساسات کی بھی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ حسن و جمال کا پاکیزہ تصور اس نظم میں ابھرتا ہے۔ اختر شیرانی نے جسمانی حسن اور قدرتی حسن کو اس نظم میں شامل کر کے دونوں حسن کے درمیان شامل حسیت کو لفظوں کے اندر بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں اختر شیرانی کی وطن پرستی کے ساتھ ساتھ جمالیات پرستی بھی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ وطن سے محبت کے ساتھ ساتھ حسن اور محبت جیسے جذبوں کو ایک ہی نظم میں بے اختیار انداز میں شامل کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اختر شیرانی نے اس نظم میں دونوں کیفیتوں کو شامل کر کے نظم کے حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم ان کے جمالیاتی احساس کے ساتھ وطن پرستی کے جذبہ کو فروغ دینے کا کام انجام دینے والی اہم نظم کا درجہ رکھتی ہے۔

24.9 نظم آخری امید

مرا ننھا جواں ہوگا

کبھی تو رحم پر آمادہ بے رحم آسماں ہوگا
کبھی تو یہ جفا پیشہ مقدر ' مہرباں ہوگا
کبھی تو سر پہ ابرِ رحمت حق گل فشاں ہوگا
مسرت کا سماں ہوگا!
مرا ننھا جواں ہوگا

کسی دن تو بھلا ہوگا ' غریبوں کی دعاؤں کا
اثر خالی نہ جائے گا ' غم آلود التجاؤں کا
نتیجہ کچھ تو نکلے گا فقیرانہ صداؤں کا
خدا گر مہرباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

خدا رکھے جواں ہوگا ' تو ایسا نوجواں ہوگا
حسیں و کارواں ہوگا ! دلیر و تیغ راں ہوگا
بہت شیریں زباں ہوگا بہت شیریں بیاں ہوگا
یہ محبوب جہاں ہوگا .
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن اور قوم کی سو جان سے خدمت کرے گا یہ
خدا کی اور خدا کے حکم کی عزت کرے گا یہ
ہر اپنے اور پرائے سے سدا الفت کرے گا یہ
ہر اک پر مہرباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن کی جنگِ آزادی میں جس نے سر کٹایا ہے
یہ اُس شیدائے ملت باپ کا پُرجوش بیٹا ہے
ابھی سے عالمِ طفلی کا ہر انداز کہتا ہے
وطن کا پاسباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا
وطن کے نام پر اک روز یہ تلوار اٹھائے گا
وطن کے دشمنوں کو کنجِ تربت میں سلائے گا
اور اپنے ملک کو غیروں کے پنجے سے چھڑائے گا
غرورِ خانداں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

صفِ دشمن میں تلوار اس کی جب شعلے گرائے گی
شجاعت بازوؤں میں بن کے بجلی لہلہائے گی
جبیں کی ہر شکن میں مرگِ دشمن تھرتھرائے گی
یہ ایسا تیغ زاں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا
سرِ میدان جس دم دشمن اس کو گھیرتے ہوں گے
بجائے خوں رگوں میں اُس کی شعلے تیرتے ہوں گے
سب اس کے حملۂ شیرانہ سے منہ پھیرتے ہوں گے
تہ و بالا جہاں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

24.9.1 نظم ''آخری امید'' کا تجزیہ

اختر شیرانی کی رومانی نظموں میں ''آخری امید'' ایک ایسی نظم ہے جس میں انہوں نے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا دلچسپ انداز سے بیان کیا ہے۔ درحقیقت یہ نظم ایک ایسی خواہش کی تکمیل ہے جس کی امید میں شاعر زندگی گزار رہا ہے۔ یہ نظم آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ ایک مصرعہ ''میرا ننھا جواں ہوگا'' کے مصرعے کی تکرار کی گئی ہے۔ شاعر کا تصور یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تمام امیدیں پامال ہوچکیں جس کے بعد وہ اپنی اولاد سے آخری امید لگائے بیٹھا ہے کہ جب وہ جواں ہوگا تو اس کی امیدوں کو بارآور ہونے کا موقع ملے گا۔ اختر شیرانی نے اس نظم کا آغاز روایتی انداز میں شکایت زمانہ سے کیا ہے۔ جس میں بے رحم آسماں جفا پیشہ مقدر کی شکایت کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی گئی ہے کہ جب ابر رحمت سر پر برسے گا تو اس مسرت کے سماں میں شاعر خود بھی شامل ہوجائے گا۔ اپنے ننھے سے امیدیں وابستہ ہیں۔ اس کو غریبوں کی دعاؤں اور فقیر کی صداؤں کے علاوہ اثر سے خالی التجاؤں کا ثمرہ قرار دیتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ خدا کی مہربانی کی بدولت ہی اس پر جوانی کی منزل نمایاں ہوگی۔ ایک ننھے کی جوانی پر رشک کرتے ہوئے شاعر نے یہ بتایا ہے کہ وہ شیریں دہن اور شیریں زبان ہونے کے علاوہ دلیر اور تلوار کا دھنی ہوگا۔ نظم کے تیسرے بند میں اختر شیرانی نے ننھے سے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ وطن اور قوم کی خدمت اور خدا کے حکم کی عزت کے علاوہ اپنے پرائے سے الفت کا سزاوار ہوگا اور ہر ایک پر مہربان ہوگا۔ اپنے ننھے کے جوان ہونے کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ وہ جنگ آزادی کا سپاہی اور شہدائے ملت کے پرجوش باپ کا بیٹا ہوگا جو وقت پڑنے پر وطن کے لیے تلوار اٹھائے گا اور دشمنوں کو قبر میں سلا کر اپنے ملک کو غلامی کے پنجوں سے چھڑائے گا۔ اس کی تلوار دشمن پر شعلے برسانے کا سبب بنے گی۔ اس کی بہادری سے بازوؤں کی قوت بگل کی طرح لہرائے گی اور جب وہ اپنی پیشانی پر بل لائے گا تو دشمن کی موت تھرتھرا اٹھے گی۔ وہ ایسا جانباز ہوگا کہ جنگ میں جب اسے دشمن گھیر لیں گے تو اس کی رگوں میں خون کے

بجائے شعلے تیرتے ہوں گے اور اس کا حملہ ایک شیر کے حملے کے برابر ہوگا اور دشمن منہ پھیرنے پر مجبور ہو جائیں گے اس طرح جب وہ غصہ میں آ جائے تو دنیا کو تہہ و بالا کر دے گا۔ غرض جب ننھا جوان ہوگا تو وہ اپنی ذات میں چھپے ہوئے جوہر کو نمایاں کر کے یہ ثابت کر دے گا کہ وہ ایک ایسا جیالا ہے کہ جس میں جواں مردی اور جانبازی کے تمام اوصاف موجود ہیں۔ اسی خواہش پر نظم کو اختر شیرانی نے حد درجہ مشتاق لہجے کے ساتھ رومانی تصور میں نمایاں کیا ہے۔ انہوں نے نظم کو حد درجہ مثبت رویوں کا علم بردار بنا دیا ہے۔

انسان اپنی زندگی کو امیدوں کے سہارے گزارتا ہے اور نیک خواہشات کو پروان چڑھانا بھی انسانی فطرت کی دلیل ہے لیکن خواہشات کی دنیا میں الجھ کر رہ جانا یا امیدوں کو ہی اپنا سرمایہ سمجھنا ایک حقیقت پسند انسان کی خوبی نہیں بلکہ ایسا کام جمالیات پسند انسان ہی کر سکتا ہے۔ اختر شیرانی نے اپنی نظم ''آخری امید'' میں ایسے ہی رومانوی جذبات کی نمائندگی کی ہے جو ہر باپ کے دلی جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن ان خواہشات کی تکمیل اولاد کے ذریعہ ممکن بھی ہو سکتی ہے اور ناممکن بھی لیکن صرف ممکنات کی بنیاد پر شاعری کو فروغ دینے اور جذبات و احساسات کو مثبت پہلو سے وابستہ کر کے یکطرفہ روش اختیار کرنا جمالیات کا وصف قرار دیا جا سکتا ہے اور اس وصف کو اختر شیرانی نے اپنی نظم ''آخری امید'' میں بطور خاص استعمال کر کے ایک حسین خواب دیکھا ہے۔ وہ خواہش یہی ہے کہ جب ان کا ننھا جواں ہوگا تو وہ قوم و ملک اور عوام کی خدمت کا فریضہ انجام دے گا۔ نیک خواہشات سے وابستہ یہ نظم اختر شیرانی کو اپنے شدید جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنا کر یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اس نظم میں تمام تر رومانی جذبات کی کارفرمائی موجود ہے اور اختر شیرانی نے نظم کو متاثر کن بنانے کے لیے تمام مثبت جذبات کو شاعری میں پیش کر دیا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایک رومان پرست انسان کی طرح اختر شیرانی نے خیالات کی دنیا میں زندگی گزاری ہے جب کہ حقیقی دنیا خیالات کی دنیا کا برعکس ہوتی ہے۔ غرض نظم ''آخری امید'' مثبت جذبات کی نمائندہ ایک رومانی نظم ہے جس میں شاعر نے توقعات کی دنیا کو نمایاں کیا ہے اور یہ توقعات اپنی اولاد سے وابستہ کر کے شاعر نے اپنی فکر اور فطری سطح کو اجاگر کر دیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظم آخری امید کا مرکزی خیال کیا ہے؟
2. نظم آخری امید میں کس سے خواہشات وابستہ کی گئی ہیں؟
3. نظم آخری امید میں رومانی جذبات کی نشاندہی کیجیے۔
4. نظم ''آخری امید'' میں کس سے عزم استقلال کی توقع کی گئی ہے؟
5. شاعر نے ننھے جواں سے کون کون سی امیدیں باندھی ہیں؟

24.10 خلاصہ

اختر شیرانی، محمود شیرانی کے بیٹے ہیں ریاست ٹونک کے مایہ ناز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش 1905ء میں ہوئی۔ اس وقت ان کے والد انگلستان کے دورہ پر تھے۔ اختر شیرانی کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی پھر انہوں نے شعر گوئی کی طرف توجہ دی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کا مزاج حسن و عشق پرست تھا۔ ان کی شاعری میں رومانویت اپنا بھرپور اثر دکھاتی ہے۔ انہوں نے حسن و عشق میں ڈوب کر شاعری کی۔ ان کی شعر گوئی میں جدت پسندی بھی دکھائی دیتی ہے۔ اختر شیرانی کا تعلق ترقی پسند شاعروں کے قافلے سے تھا لیکن انہوں نے شعر گوئی کے لیے ترقی پسند نظریات سے خود کو الگ کیا۔ انہوں نے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے علاوہ جنگ اور جدوجہد آزادی پر بھی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں بھی رومانویت کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ انہوں نے خواتین اور بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھی ہیں اور ان کی نظموں میں نفسیاتی پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ انھیں کئی عشق کیے مگر ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ذاتی کشمکش کا شکار رہے اور اسی کشمکش نے انہیں مے نوشی کی طرف راغب کیا۔ لاہور پہنچے تو وہاں کے ماحول میں شاعری کے جوہر دکھائے۔ ان کا عشق بلاشبہ افلاطونی عشق تھا اور وہ اسی کے سہارے اپنی زندگی گزارتے رہے۔ انہوں نے سلمیٰ اور عذرا کے علاوہ جتنی خواتین کے نام نظموں میں استعمال کیے ہیں انہیں جذباتی اور رومانی انداز میں یاد کرتے رہے ہیں۔ رومانویت ان کی شاعری ہی نہیں بلکہ زندگی کا ایک وسیلہ بن گئی تھی۔ اختر شیرانی کی نظمیں اردو کی رومانوی شاعری کی سب سے بہترین نظمیں قرار دی جاتی ہیں اور انہیں خصوصیات کی وجہ سے اختر شیرانی کو نظم کی شاعری میں انفرادی مقام حاصل ہے۔ نظم گوئی میں رومانویت کو سمونے والا یہ شاعر 1948ء کو اس دنیا سے رخصت ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر صرف 43 سال تھی۔

24.11 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. اختر شیرانی کی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں؟
2. اختر شیرانی کی نظم نگاری کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. اختر شیرانی کے حالات زندگی بیان کیجیے
2. اختر شیرانی کی نظموں کی ہیئتوں کا جائزہ لیجیے۔
3. اختر شیرانی کے عہد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
4. ''اے عشق کہیں لے چل'' کا خلاصہ لکھیے۔
5. ''او دیس سے آنے والے بتا'' نظم کے وطنی اور رومانوی عناصر کا جائزہ لیجیے۔
6. نظم ''آخری امید'' کے محاسن بیان کیجیے۔
7. اردو شاعری میں اختر شیرانی کا مقام و مرتبہ کیوں بلند ہے؟

24.12 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
محور	=	جس پر پہیہ گردش کرتا ہے	وابستہ	=	متعلق، بندھا ہوا	نیک نفسی	=	اچھی نیت والا
باضابطہ	=	طریقے سے	استفادہ	=	فائدہ حاصل کرنا	وارفتگی	=	بے خودی، فدا ہونے کی کیفیت
منافقت	=	ظاہر اور باطن میں فرق	ثقیل	=	بھاری، ناقابل ہضم	میلانات	=	توجہ، رجحانات
ہئیت	=	بناوٹ، شکل	گریز	=	پرہیز، علاحدگی	حسّی پیکر	=	احساس جگانے والی صورت
ترسیل	=	روانہ کرنا	مجہول	=	ست، نکما	پیراہن	=	لباس، بدن ڈھانکنے کا کپڑا
تشنگی	=	پیاس	وارفتہ	=	فدا ہونا	جلوہ گر	=	نمایاں ہونا
حامی	=	حمایت کرنے والا	ہم آہنگ	=	سُر میں شریک، متفق رائے	ملکوتی	=	فرشتوں جیسا
خاصیت	=	تاثیر، گُن	خودسپردگی	=	خود کو حوالے کر دینا	فوق النساء	=	عورت کی نسوانیت سے برتر
جداگانہ	=	الگ الگ، منفرد	حسن پرست	=	حسن کو چاہنے والا	پیکر	=	چہرہ، شکل، صورت
ازالہ	=	زائل کرنا، مٹانا	مستعار	=	اُدھار مانگا ہوا	خول	=	اوپر کا غلاف
شعار	=	طریقہ	فانی	=	فنا ہونے والا	تشنگی	=	پیاس

24.13 سفارش کردہ کتابیں

1. اختر شیرانی — ڈاکٹر یونس حسنی، مطبوعہ کراچی
2. انتخاب اختر شیرانی — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
3. مکتوبات اختر شیرانی — ڈاکٹر یوسف حسنی

اکائی: 25 جوش ملیح آبادی۔ حیات اور نظم نگاری کی خصوصیات

ساخت

25.1 تمہید

25.2 حالاتِ زندگی

25.2.1 پیدائش اور تعلیم و تربیت

25.2.2 شعر گوئی کی ابتدا

25.2.3 جوش اور حیدر آباد

25.2.4 حیدر آباد کے بعد جوش کی دیگر ملازمتیں

25.2.5 جوش کی پاکستان کو ہجرت

25.3 جوش کی نظم گوئی

25.3.1 جوش، شاعر فطرت

25.3.2 جوش کی منظر نگاری

25.3.3 جوش، شاعر حسن و عشق

25.4 جوش کی چند نظمیں

25.4.1 نظم ''شکست زنداں کا خواب''

25.4.2 نظم ''بدلی کا چاند''

25.4.3 نظم ''کسان''

25.5 چند اشعار کی تشریح

25.6 خلاصہ

25.7 نمونہ امتحانی سوالات

25.8 فرہنگ

25.9 سفارش کردہ کتابیں

25.1 تمہید

علامہ اقبالؔ بیسویں صدی کے سب سے ممتاز شاعر ہیں۔ اقبال کے بعد اردو شاعری کے جو دو بڑے نام ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں زمانی ترتیب کے اعتبار سے جوش کو دوسرا بڑا شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔

جوش کی شاعری کے کئی پہلو ہیں۔ وہ شاعرِ فطرت ہیں، ان کی بہت سی نظموں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ شاعرِ رومان بھی تھے۔ ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے انہوں نے نظم اور مسلسل غزل دونوں میں ایسی رومانی شاعری کی ہے جسے اردو کی اعلا ترین رومانی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ جوش کو شاعرِ انقلاب بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی زبردست آواز بلند کی اور انقلاب کے ایسے نعرے لگائے کہ ان کا یہ شعر عوام و خواص سب کی زبان پر تھا:

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

چنانچہ جنگِ آزادی کے زمانے کی ان کی وطنی اور انقلابی شاعری کے تناظر میں ہندوستانی عوام نے انہیں 'شاعرِ انقلاب' کے خطاب سے نوازا۔ میر انیس کے بعد جوش وہ واحد شاعر ہیں جنہیں زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کے پاس الفاظ کا بیش بہا خزانہ تھا۔ عشق و محبت اور رومانی شاعری اور فطرت نگاری کے لیے وہ جو نرم اور سبک الفاظ استعمال کرتے ہیں ان میں پھولوں کی خوشبو ہوتی ہے اور جب وہ انقلابی شاعر کی حیثیت سے گرج رہے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ الفاظ کی گھن گرج سے محسوس ہوتا ہے کہ زلزلہ آ گیا ہے۔ جوش کی زباں دانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے کی قطار باندھے کھڑے رہتے تھے۔ انیس کے بعد زبان پر سب سے زیادہ قدرت انھیں ہی حاصل تھی

25.2 حالاتِ زندگی

شبیر حسن خاں جوش کے اجداد میں ایک بزرگ یار بیگ خاں درہ خیبر کے سرداروں میں تھے۔ یار بیگ خاں کے دو صاحبزادے تھے محمد نام دار خان اور محمد بلند خان۔ ان دونوں بھائیوں میں نام دار خان تو اپنے وطن ہی میں رہے لیکن محمد بلند خان اپنے دو بیٹوں محمد عوض خان اور فقیر محمد خان کے ساتھ 1819ء کے آس پاس ہندوستان آ کر اتر پردیش میں قائم گنج میں آباد ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد وہ لکھنؤ منتقل ہو گئے جہاں نواب غازی الدین حیدر کی فوج میں تین سو روپے ماہوار پر انہیں ملازمت مل گئی۔ نواب غازی الدین حیدر نے لکھنؤ کے پاس ملیح آباد میں انہیں کنول ہار نام کا ایک محلہ دے دیا جہاں محمد بلند خاں نے اپنے اور اپنے ملازموں کے لیے مکانات بنا دیے۔ محمد بلند خاں کے بڑے بیٹے محمد عوض خاں' ریاست اندور چلے گئے۔ وہاں مہاراجا ہولکر کی فوج میں رسالدار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ پانچ چھ سال بعد عوض خاں کے چھوٹے بھائی فقیر محمد خاں بھی تعلیم سے فارغ ہو کر اندور آ گئے اور مہاراجا ہولکر کی فوج میں رسالدار ہو گئے۔ محمد عوض خاں تو اندور ہی میں رہے لیکن کچھ عرصے بعد فقیر محمد خاں' نواب میر خاں کے پاس ٹونک چلے گئے جہاں نواب نے اپنی فوج میں انہیں رسالدار مقرر کر دیا۔

کچھ عرصے بعد ٹونک کے نواب اور انگریزوں میں لڑائی ہو گئی۔ اس لڑائی میں فقیر محمد خان بھی شریک تھے۔ انہوں نے ایسی بہادری اور دلیری سے کام لیا کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے اور انگریزی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ فقیر محمد خان اس لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے۔ نواب میر خاں نے ان کی تیمارداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دو تین مہینے میں فقیر محمد خان صحت یاب ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد ٹونک کے نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو حکم دیا کہ وہ جے پور اور بھوپال پر حملہ کریں۔ فقیر محمد خاں فوج لے کر وہاں پہنچے لیکن فوج کے سامنے جے پور کی رانی اور بیگم بھوپال دونوں نے صلح کے جھنڈے لہرا دیے۔ کچھ عرصہ بعد فقیر محمد خاں' غازی الدین حیدر کے پاس لکھنؤ آ گئے ہیں جہاں انہیں پچیس ہزار سواروں کا رسالدار بنا دیا گیا اور بعد میں وزارت مال بھی ان کے سپرد کر دی گئی۔ غازی الدین حیدر نے لکھنؤ کے گولہ گنج میں زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا فقیر محمد خاں کو عنایت کیا۔ جہاں فقیر محمد خاں نے اپنے اور اپنے سپاہیوں کے لیے مکانات تعمیر کیے۔ فقیر محمد خاں فارسی اور اردو کے بہت مشہور شاعر تھے۔ گویا ان کا تخلص تھا۔

یہاں تک ذکر تھا جوش کے پردادا کا۔ اب ان کے دادا کا حال سنیے۔ دادا کا نام محمد احمد خاں بہادر تھا۔ انہیں اپنے باپ سے وراثت میں بے انتہا دولت ملی تھی۔ انہوں نے ملیح آباد میں رہنے کے لیے مکانات بنائے تھے۔ ان کی فیاضی کا بہت چرچا تھا۔ غریبوں میں پیسہ پانی کی طرح بہا دیا کرتے تھے۔ محمد احمد خاں بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے دیوان کا نام 'دیوان احمد' تھا۔ یہ دیوان پانچ سو صفحات پر مشتمل تھا۔

25.2.1 پیدائش اور تعلیم و تربیت

جوش کے والد کا نام نواب بشیر احمد خاں اور تخلص بشیر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا خوب صورت انسان تھے۔ فارسی زبان اور تاریخ اسلام پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انہیں سعدی' حافظ اور فردوسی کا پورا کلام ازبر تھا۔ اردو میں میر تقی میر اور میر انیس کے زبردست مداح تھے۔ شاعری میں پہلے مرزا داغ کے شاگرد ہوئے اس کے بعد امیر مینائی اور جلال لکھنوی سے اصلاح لی۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی بہت فیاض تھے۔ ان کی سرکار سے سینکڑوں بیواؤں' یتیموں اور بوڑھوں کو ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ مختلف لوگوں نے جوش کی تاریخ ولادت لکھی ہے۔ کسی نے 1896ء اور کسی نے 1898ء لکھا ہے۔ لیکن خود جوش کا بیان ہے کہ وہ 5 دسمبر 1898ء کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ جوش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مولوی نیاز علی خاں نے انہیں فارسی' مولانا طاہر نے اردو' مولوی قدرت اللہ بیگ نے عربی اور ماسٹر گومتی پرشاد نے انگریزی پڑھائی۔ جب گھر کی تعلیم مکمل ہو گئی تو انھیں سیتاپور بھیج دیا گیا۔ جہاں فرنچ ایچ اسکول میں انہیں داخل کر دیا گیا۔ ڈیڑھ سال تک جوش نے وہاں تعلیم حاصل کی اور پھر ان کے والد نے سیتاپور سے واپس بلا کر لکھنؤ کے حسین آباد اسکول

میں داخل کردیا جہاں جوش نے چھٹی اور ساتویں کے ایک ساتھ امتحان دیے اور آٹھویں کلاس میں داخل ہوگئے۔ 1912ء میں جوش کو علی گڑھ بھیج دیا گیا اور ایم۔اے۔او کالج میں داخل کرادیا گیا۔ شرارتوں کی وجہ سے علی گڑھ کالج سے نکالے گئے تو دوبارہ آئے اور یہاں جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہوگئے۔ اس کے بعد وہ اسی شہر میں چرچ مشن اسکول اور ریڈ کرسچین کالجیٹ اسکول میں داخل ہوگئے۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران انہوں نے مرزا ہادی حسن رسوا سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ لکھنو سے جوش پیٹرز کالج آگرہ چلے گئے۔ آگرے میں زیر تعلیم تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ یہ واقعہ 1916ء کا ہے۔ آگرہ میں جوش نے سینئر کیمبرج تعلیم حاصل کی۔ جوش نے اپنے خودنوشت سوانح ''یادوں کی برات'' میں لکھا ہے کہ وہ چھ مہینے شانتی نکیتن میں رہے۔ یہ دن انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ گزارے۔ شانتی نکیتن سے جوش ملیح آبادی واپس آگئے۔ یہاں ان کے ذمے جائیداد کی دیکھ بھال ہوگئی۔ یہیں انہوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا اور فارسی کے بڑے شاعروں کا مثلاً سعدیؔ، حافظؔ، خیامؔ، فردوسیؔ، عرفیؔ اور خاقانیؔ وغیرہ کا کلام پڑھا۔

25.2.2 شعر گوئی کی ابتدا

جوش کے والد کو یہ پسند نہیں تھا کہ جوش شاعری کریں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پوری کوشش کی تھی کہ جوش شعر گوئی سے باز آجائیں۔ اس سلسلے میں جوش نے اپنے پہلے مجموعہ کلام کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

> ''میں نے نو برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ یہ بات میں نے خلاف واقعہ لکھی ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ میں شعر نہیں کہتا تھا بلکہ شعر خود کو مجھ سے کہلواتا تھا۔''

جوش کے والد شاعری کے اتنے خلاف تھے کہ جوش چوری چھپے شعر کہا کرتے تھے۔ اگر کبھی شعر کہتے ہوئے پکڑے جاتے تو انہیں سخت سزا دی جاتی۔ کم سے کم سزا یہ تھی کہ ان کا جیب خرچ بند کردیا جاتا یا والد کے ساتھ دسترخوان پر کھانے کھانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس پابندی کا جوش کی صحت پر بُرا اثر پڑنے لگا۔ ایک دفعہ جوش بے ہوش ہوگئے تو انہیں اجازت دے دی گئی۔ جوش نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی۔ لیکن بہت جلد نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ غزل اور نظم کے علاوہ انہوں نے مرثیے، سلام، گیت، رباعیاں اور قطعے بھی کہے۔ جوش کے والد کے انتقال کے بعد ان کی جائیداد تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ جوش فطرتاً لاابالی تھے۔ اپنی جائیداد کی دیکھ بھال میں ذمہ داری سے کام نہیں لیتے تھے اس لیے ان کے بڑے بھائی نے دستاویزوں پر جوش کے دستخط کرالیے جس کی وجہ سے جوش اپنی جائیداد کے بہت بڑے حصے سے محروم ہوگئے۔

جوش کو بچپن ہی سے انگریزوں سے نفرت تھی۔ چنانچہ والد کے انتقال کے بعد اتر پردیش کے گورنر سر ہارکورٹ بٹلر نے بلا کر ڈپٹی کلکٹر یا اسپیشل کورٹ آف وارڈ کی ملازمت پیش کش کی تو انہوں نے یہ پیش کش ٹھکرادی۔

1918ء میں جوش کو ہندوستان کی سیاست میں دلچسپی ہوگئی اور وہ کانگریس کی جنگ آزادی کی تحریک سے بہت متاثر ہوئے۔ اس زمانے میں احمد آباد میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ جوش بھی وہیں چلے گئے اور وہاں ان کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے ہوئی اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے مہاتما گاندھی سے ان کا تعارف کرایا۔ وہیں جوش کی ملاقات پنڈت نہرو، ان کی بہن وجے لکشمی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد سبحانی سے ہوئی۔ اسی کانفرنس میں جوش، مولانا حسرت موہانی اور کانگریس کے بہت سے دوسرے اہم رہنماؤں سے ملے۔ کچھ ہی عرصے بعد جب جوش لکھنؤ پہنچے تو وہاں ٹیگور آئے ہوئے تھے۔ جوش ٹیگور سے ملنے گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت متاثر ہوئے۔ ٹیگور نے جوش سے کہا کہ میرے والد فارسی کے بہت بڑے اسکالر تھے اور وہ حافظ کا دیوان اپنے سرہانے رکھتے تھے۔ جب جوش رخصت ہونے لگے تو ٹیگور نے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے پاس کچھ دن کے لیے شانتی نکیتن آئیں اور مجھے حافظ کے کلام کو سمجھنے میں مدد کریں۔ جوش نے یہ دعوت قبول کرلی اور کچھ دن کے بعد شانتی نکیتن پہنچ گئے۔ وہاں رہ کر جوش نے ٹیگور کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی۔ جوش کا ٹیگور کے بارے میں خیال تھا کہ وہ نہایت دلچسپ، بے حد شریف، مہذب، حساس اور حسن پرست تھے۔ ہاں ان کی نمود و نمائش جوش کو پسند نہیں تھی۔ جوش شانتی نکیتن میں چھے مہینے کے قیام کے بعد اپنے وطن واپس آگئے۔

25.2.3 جوش اور حیدرآباد

1922ء کا واقعہ ہے کہ جوش کو خیال آیا کہ ان کی جائیداد کا کام کرنے والے تھوڑی تھوڑی کرکے ساری جائیداد ختم کرچکے ہیں اور اب بیوی بچوں کے لیے ان کے پاس کچھ زیادہ رقم نہیں بچی۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ حیدرآباد جاکر ملازمت کی کوشش کریں۔ جوش نے عثمانیہ یونیورسٹی کے

پروفیسر وحید الدین سلیم سے خط و کتابت کی اور حیدر آباد کے مہاراجا کرشن پرشاد کے نام علامہ اقبال' اکبر الہ آبادی' عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی جیسی اہم شخصیتوں کے سفارشی خطوط لے کر 1924 کے آغاز میں وہ حیدر آباد پہنچ گئے۔ وہاں جوش کئی مہینے تک ملازمت کے لیے کوشش کرتے رہے لیکن کوئی صورت نہیں نکلی۔

ایک دن حیدر آباد کے نواب میر عثمان علی خاں نے انہیں بلایا اور دوران گفتگو جوش سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جب جوش نے اپنا کلام سنایا تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ ایک ہفتے بعد حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں انگریزی ادب کے مترجم کے طور پر جوش کا تقرر ہو گیا۔ جوش کی زندگی عیش و آرام سے گزرنے لگی لیکن انسان کے دن ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ خود مختار ریاست حیدر آباد میں سازشوں کا بازار گرم رہتا تھا۔ جب کوئی بھی شخص حضور نظام سے قریب ہوتا تو اس کے خلاف سازشوں کا جال بچھ جاتا۔ ایسا ہی جوش کے ساتھ ہوا۔ کسی مشاعرے میں جوش نے ایک ایسی نظم پڑھی جس میں نواب میر عثمان علی خاں کے بارے میں اشارتاً کچھ نازیبا باتیں کہی گئی تھیں۔ کسی نے اس نظم کے اشعار جا کر حضور نظام کو سنائے تو وہ ناراض ہو گئے اور یہ معاملہ اس حد تک بڑھا کہ حضور نظام نے انہیں حیدر آباد سے نکلنے کا حکم دے دیا۔ جوش حیدر آباد سے نکل کر پہلے دتیا ریاست آئے اور وہاں سے دھولپور پہنچے لیکن کہیں مناسب انتظام نہیں ہو سکا۔ وہ بالآخر دہلی آئے۔

25.2.4 حیدر آباد کے بعد جوش کی دیگر ملازمتیں

مسز سروجنی نائیڈو جوش کی بہت بڑی مداح تھیں اور اکثر خود ان کا کلام سنتی تھیں اور دوسری اہم شخصیتوں تک پہنچاتی تھیں۔ دہلی میں مسز نائیڈو سے جوش کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے تجویز پیش کی کہ آپ دہلی سے ایک رسالہ نکالیے۔ جوش پریشان تھے کہ رسالے نکالنے کے لیے رقم کہاں سے ملے گی۔ مسز نائیڈو نے کہا کہ جائیے میرے کمرے میں۔ ایک بہت بڑا لفافہ رکھا ہے وہ خاموشی سے لے کر چلے جائیے اور رسالہ نکالنے کی تیاری کیجیے۔ جوش نے کمرے میں جا کر وہ لفافہ لے لیا۔ دہلی سے 'کلیم' نام سے ایک رسالہ جاری کر دیا۔ پہلے تو اس رسالے کی حالت بہت اچھی رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ جوش کے شاعرانہ مزاج کی وجہ سے 'کلیم' کی مالی حالت خراب ہونی شروع ہو گئی۔ کئی منزلوں سے گزر کر جوش کو یہ رسالہ بند کرنا پڑا۔

جوش اور ساغر نظامی ایک مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی گئے ہوئے تھے جہاں ان کی ملاقات شالیمار پکچرز کے مالک زیڈ احمد سے ہوئی۔ احمد صاحب نے دونوں کو فلموں میں اپنی کمپنی میں ملازمت کی پیش کش کی جو ان دونوں نے قبول کر لی۔ کسی بات پر ان کی زیڈ احمد سے ان بن ہو گئی اور انہوں نے یہ ملازمت ترک کر دی۔ یہ 1948ء کا زمانہ ہے۔ دہلی سے شائع ہونے والے ماہانہ 'آج کل' کے ایڈیٹر کے لیے اشتہار شائع ہوا اور پنڈت نہرو نے اس عہدے پر جوش کا تقرر کرا دیا۔ کچھ دن بعد جوش آل انڈیا ریڈیو کے ایڈوائزر بھی مقرر ہو گئے۔ اس طرح جوش کو پھر عیش و آرام میسر ہو گیا لیکن ابھی ان کی قسمت میں بہت سے نشیب و فراز باقی تھے۔

25.2.5 جوش کی پاکستان کو ہجرت

1955ء میں جوش ایک مشاعرے کے سلسلے میں پاکستان گئے تو ایک پرانے دوست سید ابو طالب نقوی کراچی کے چیف کمشنر تھے۔ وہ جوش کو پہلے بھی کراچی آنے کی دعوت دے چکے تھے اور اس دفعہ انہوں نے اتنا اصرار کیا اور ایسے خواب دکھائے کہ جوش ترک وطن کر کے کراچی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ عام خیال ہے کہ جوش کی یہ وہ غلطی تھی جس کی قیمت انہیں زندگی کے آخری ایام تک چکانی پڑی۔ جب جوش پاکستان پہنچے تو مخالفتوں کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں کے شاعر اور ادیب یہ سمجھنے لگے کہ جوش کے سامنے ان کا چراغ نہیں جلے گا۔ جوش نے اپنی خودنشت سوانح 'یادوں کی برات' میں پاکستان میں اپنی ناکامیوں کی تفصیل اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کی ہے:

1. جہانگیر روڈ کا سینما پلاٹ' اور باغ لگانے کی زمین ملی۔ خود میں نے واپس کر دی۔
2. ایک سوسائٹی کا سینما پلاٹ' نیلام میں' میرے نام چھوٹا۔ قیمت ادا نہ کر سکا اس لیے نکل گیا۔
3. کاشتکاری کے لیے ہاشمی صاحب' ڈپٹی کمشنر کراچی نے پچاس ایکڑ زمین دی۔ الطاف گوہر نے اسے ضبط کر لیا۔
4. سائیکل رکشاؤں کے پرمٹ ملے۔ نرخ گر گیا' پرمٹ ہوا میں اڑ گئے۔
5. کولڈ اسٹوریج کی اجازت مل گئی۔ روپیہ لگانے والوں کو ورغلا دیا گیا۔

6. واجد علی شاہ کنٹرول ریٹ پر بسیس دینے پر آمادہ ہوگئے۔ روپیہ لگانے والے کو روک دیا گیا۔
7. بیڑی کے پتوں کا لائسنس مل رہا تھا۔ لائسنس دینے والے کے غمزے برداشت نہ کر سکا' اسے برا بھلا کہہ کر گھر آ گیا۔
8. سنیما کے ساز و سامان کا' دوسرے دن پرمٹ مل رہا تھا۔ وزیر معطل کر دیا گیا
9. ٹکسٹائل کا اجازت نامہ ملنے والا تھا۔ وزیر بدل گیا۔
10. پریس قائم کرنے کا اجازت نامہ لکھ کر تیار ہو گیا۔ دستخط کرنے سے پیشتر وزیر کو نکال دیا گیا۔
11. مچھلی کی تجارت کا پرمٹ مل گیا تھا۔ سکریٹری کو برطرف کر دیا گیا۔
12. پٹرول پمپ کی سعی۔ کی ناکام ہوگئی۔
13. ایک مکان الاٹ ہوا تھا' آج تک قبضہ نہ مل سکا۔
14. دیہی ترقی کے محکمے میں نوکری کی درخواست دی' منظور نہیں ہوئی۔
15. اپنی کتابوں کی طباعت و اشاعت چاہی۔ کوئی ناشر تیار نہیں ہوا۔
16. فریئر ہال کے ایک گوشے میں ریستوراں کھلوا دینے کا وعدہ محکم کیا گیا۔ افسر صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔
17. سندھی ادبی بورڈ میں ایک علمی کام کیا۔ اجرت نہیں ملی۔
18. محکمہ آبادکاری کے ایک افسر صاحب نے مکان کی زمین الاٹ کر دی۔ چلتے وقت وہ کھڑے نہیں ہوئے۔ الاٹمنٹ کا پرزہ پھاڑ کر ان کے سامنے پھینک دیا۔
19. پنجاب کے چیف منسٹر قزلباش صاحب' ایک کارخانے کا پرمٹ دے رہے تھے کہ اسی دن فوجی انقلاب آ گیا اور ان کی وزارت نے دم توڑ دیا۔

الغرض: جس جگہ ہم نے بنایا گھر' سڑک میں آ گیا

جوش نے مستقل طور پر اسلام آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ جو شخص محفلوں کی جان تھا اور جس کے دم سے ہندوستان میں محفلوں کی رونق ہوتی تھی وہ اسلام آباد کے ایک گھر میں تنہا پڑا رہتا تھا۔ 22 فبروری 1982 کو اردو دنیا اپنے عظیم شاعر سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. جوش کے اجداد ہندوستان کہاں سے آئے تھے؟
2. جوش نے کس عمر میں شاعری شروع کی؟
3. جوش ایک بہت دولت مند خاندان سے ہوتے ہوئے بھی مالی اعتبار سے کیوں پریشان ہو گئے؟
4. جوش حیدر آباد سے کیوں نکالے گئے؟
5. جوش کب پاکستان گئے؟

25.3 جوش کی نظم گوئی

جوش کو شاعر انقلاب' شاعر شباب اور شاعر فطرت کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کی انقلابی فکر ہے۔ برطانوی حکومت کے ظلم و استبداد نے ان میں بغاوت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ ان میں انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزاد کرانے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار تھے۔

برطانوی سامراج کے خلاف اور جنگ آزادی کے موضوع پر اردو میں بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں لیکن اس موضوع پر جوش کی نظموں کا معیار جتنا بلند ہے اور آزادی حاصل کرنے کے جذبے کی شدت جتنی جوش کی نظموں میں ہے اتنی شاذ و نادر ہی کسی شاعر کے ہاں ملے گی۔

جوش ہماری جنگ آزادی کے سب سے قد آور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری نے لاکھوں مجاہدین آزادی میں آزادی حاصل کرنے کا آہنی عزم پیدا کیا۔ سر پر کفن باندھ کر آزادی کے میدان جنگ میں اترنے کے لیے ولولہ' ہمت اور حوصلہ پیدا کیا۔ جوش نے جنگ آزادی کے سلسلے میں 'ایسٹ انڈیا کمپنی

کے فرزندوں سے' کے عنوان سے جو نظم لکھی تھی اسے جنگ آزادی کے مجاہدین اور محبِ وطن ہندوستانیوں میں جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی زمانے میں اردو کی کسی نظم کو حاصل نہیں ہوئی۔ یہ نظم لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کی گئی تھی۔ یہ چھپی ہوئی نظم نئی دہلی کے نیشنل آرکائیوز میں جنگ آزادی کے دوران ضبط ہونے والے ادب کے ذخیرے میں موجود ہے۔ کسی سرکاری افسر نے اس نظم پر ایک نوٹ لکھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ 'یہ نظم لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر ہندوستان اور خاص طور سے یو۔ پی' بنگال اور پنجاب میں تقسیم کی گئی ہے' اس نظم کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ مجاہدین آزادی جلوس کی صورت میں شہر کا چکر لگاتے تھے اور سب مل کر یہ نظم پڑھتے تھے۔ برطانوی حکومت نے یہ نظم ضبط کر لی تھی۔

اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

کس زبان سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو؟ — '' دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

''جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر' بھیڑیا ہے بھیڑیا — ''بھیڑیے کو مار دو گولی' پئے امن و بقا

''باغ انسانی میں چلنے ہی کو ہے بادِ خزاں — آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں

پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے — ڈائر گرگ خوں آلود اب بھی زندہ ہے

وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے — اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی — جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں — موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

ہم جنگِ آزادی کے اس زمانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے جب دنیا کی سب سے بڑی طاقت یعنی برطانوی حکومت سے نہتے ہندوستانی' صرف اپنی ہمت اور حوصلے کے بل پر' وطن عزیز کی آزادی کے لیے ظالم سامراجیوں سے لوہا لے رہے تھے۔ اس وقت ہزاروں کی تعداد میں مجاہدین آزادی دار و رسن کی آزمائش سے گزر رہے تھے۔ جوش نے 'بغاوت' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی تھی۔ یہ نظم ایک جانباز مجاہد ہی لکھ سکتا تھا' جسے موت کا خوف نہ ہو۔

اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہاں بغاوت' آگ' بجلی اور آندھی میرا نام — میرے گرد و پیش اجل' میرے جلو میں قتلِ عام

زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات — کانپ اٹھتی ہے مری چین جبین سے کائنات

الحذر' میری کڑک کا زور' ہنگام مصاف — صاف پڑ جاتا ہے ایوانِ حکومت میں شگاف

اللہ اللہ بزم ہستی میں مری گل باریاں — ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو ریزہ ریزہ استخواں

الامان والحذر' میری کڑک' میرا جلال — خون سفاکی' گرج طوفان' بربادی' قتال

جوش کی ایک نظم ہے جس میں انقلاب کا نعرہ اس طرح بلند کیا گیا ہے جیسے آندھی اور طوفان کی طرح مجاہدوں کی فوج دشمنوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ وطن کی محبت اور اس پر قربان ہونے کے جذبے نے اس فوج کو ہر سپاہی میں شہادت کا وہ جذبہ پیدا کر دیا ہے جو انسان کو دنیا کے ہر خطرے سے اور حد تو یہ ہے کہ موت سے بھی بے خوف کر دیتا ہے۔ اس نظم کے چند شعر ہیں:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب — میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

کوئی قوت راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں — کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں

پھر اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا — گھومتا' گھرتا' گرجتا' گونجتا' گاتا ہوا

خون میں لتھڑی' بساطِ کفر و دیں الٹے ہوئے — فخر سے سینے کو تانے آستیں الٹے ہوئے

ولولوں سے برق کی مانند لہراتا ہوا — موت کے سائے میں رہ کر موت پر چھاتا ہوا

جنگِ آزادی کے موضوع پر جوشؔ کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو اردو کی ادبی تاریخ کا اہم حصہ ہیں اور جنگِ آزادی کی تاریخ بھی ہیں۔ اس موضوع پر جوشؔ کی بعض نظمیں ہمیشہ جنگِ آزادی کی تاریخ کا اہم حصہ رہیں گی۔ یہ نظمیں ہیں۔ 'بیدار ہو بیدار'، 'غدار سے خطاب'، 'شکستِ زنداں کا خواب'، 'بھوکا ہندوستان'، 'حیف اے ہندوستان'، 'زنداں کا گیت'، 'دردِ مشترک'، 'ترانہ آزادیِ ہند'، 'دعوت انقلاب'، 'اٹھ اے ندیم'، 'کسان'۔ ان کے علاوہ بھی اس موضوع پر خاصی تعداد میں نظمیں ہیں۔

25.3.1 جوش.....شاعرِ فطرت

جوش اردو کے واحد شاعر ہیں جنہیں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ انہیں شاعرِ فطرت بھی کہا جاتا ہے۔

اردو میں فطرت نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس کے بہت اچھے نمونے ہمیں اردو مثنویوں میں مل جاتے ہیں لیکن جوش نے فطرت نگاری کے فن کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔ جوش کو فطری مناظر سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ مناظرِ فطرت کے زبردست عاشق تھے۔ انہیں صبح کو پو پھٹنے کا منظر بہت پسند تھا۔ اسی لیے وہ صبح چار بجے اٹھ کر باغوں کی سیر کو چلے جاتے تھے۔ صبح کے حسین مناظر سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ صبح کے مناظر انہیں اتنے دلکش لگتے تھے کہ کہا کرتے تھے 'ان میں انہیں قدرت حق کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔'

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

جوش کی ایک نظم 'پیغمبرِ فطرت' ہے۔ اس نظم کے شروع میں جوش نے صبح کا منظر انتہائی خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

تاروں نے جھلملا کے جو چھیڑا ستارِ صبح — گانے لگی چمن میں نسیمِ بہارِ صبح
غنچوں میں چشمِ ناز سے ٹپکا خمارِ صبح — ابھرا افق سے جامِ زمرد نگارِ صبح
شاعر کی روحِ عشق کی ہم راز ہوگئی — دنیا تمام جلوہ گہِ ناز ہوگئی

جوش فطرت کی منظر کشی میں خوبصورت استعاروں، نادر تشبیہوں، اچھوتے تخیل اور معنی آفرینی سے کام لیتے ہیں۔ وہ جزئیات نگاری سے کام لے کر منظر کی پوری تصویر اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ تصویر کا ایک ایک پہلو دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے۔ جوش کی ایک نظم ہے 'پانچ نغمے'۔ اس نظم کے تیسرے بند یا تیسرے نغمے میں جوش نے چڑیوں کی حرکات و سکنات بہت دلچسپ سادہ اور دلنشیں انداز میں بیان کی ہے۔ اس نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں:

مہکتے ہوئے پھول کے پاس آؤ
لچکتی ہوئی شاخ پر بیٹھ جاؤ
ہوا میں کبھی اڑ کے بازو ہلاؤ
کبھی صاف چشمے میں غوطہ لگاؤ
یونہی پیاری چڑیو ابھی اور گاؤ

کبھی برگِ تازہ کو منہ میں دباؤ
کبھی کنج میں بیٹھ کر پھڑپھڑاؤ
کبھی گھاس پر لوٹ کر دل لبھاؤ
کبھی جا کے بیلوں کو جھولا جھلاؤ
یونہی پیاری چڑیو ابھی اور گاؤ

25.3.2 جوش کی منظر نگاری

جوش کا مشاہدہ بہت گہرا اور وسیع ہے۔ وہ جب بھی کوئی منظر پیش کرتے ہیں اس کی تمام تفصیلات اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے وہ کسی مقام پر کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے 'گرمی اور دیہاتی بازار'۔ شاعر تو کیا کسی نثر نگار نے بھی دیہاتی بازار کا ایسا منظر نہ کھینچا ہوگا' جیسا جوش کی اس نظم میں ہے۔ دیہاتی زندگی کا بہت قریب سے اور بہت گہرا مشاہدہ کیا اور نظم لکھتے ہوئے ان کے ذہن میں دیہاتی بازار کا پورا منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ محفوظ تھا۔ اب اس نظم کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں دیہاتی بہار کی مکمل عکاسی کی گئی ہے:

شور، ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، بخار — بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں، قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بو، مرچوں کی دھانس — خربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز گھانس
دھوپ کی شدت، ہوا کی یورش، گرمی کی رو — کملیوں پر سرخ چاول ٹاٹ کے ٹکڑوں پر جو
گرم ذرّوں کے شدائد، جھکڑوں کی سختیاں — جھکڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کی دھواں

جب برسات کی پہلی گھٹا جھوم کر برستی ہے تو خوشی و مسرت اور کیف و سرور سے جوش بھی جھوم جھوم جاتے ہیں اور اس حسین منظر کو ایسے دلکش الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ سننے والے کے دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

کیا جوانی ہے فضا میں مرحبا صد مرحبا
چل رہی ہے روح کو چھوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
آرہی ہے دور سے کافر پپیہے کی صدا
حسن اٹھا ہے خاک سے انگڑائیاں لیتا ہوا
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

مطربوں نے ساحلوں پر جا کے چھیڑے ہیں ستار
ہل دھرے کاندھے پر ہنستے جا رہے ہیں کاشت کار
مست ہے جنگل میں چرواہا، چمن میں جوئے بار
گا رہا ہے ناخدا دریا کے سینے پر ملار
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

جوش کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے 'غریب الوطن کا پیام'۔ اس نظم میں ایک ایسے شخص کے جذبات بیان کیے ہیں جو فطری مناظر سے دور شہر کے ہنگاموں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس نظم کے آخری حصے کے چھے اشعار ملاحظہ ہوں:

اے چاند جب ستارے گردوں پر جھلملائیں — جب قدرتی مناظر صحرا میں مسکرائیں
تاروں کی کشمکش میں جب چاندنی ہو پھیکی — چادر سرک گئی ہو ماتھے سے جب کسی کی
بے داغ جب زمیں ہو اور آسماں کورا — جب سینۂ افق پر غلطاں ہو سرخ ڈورا
مغموم جھاڑیوں سے میرا سلام کہنا — آنکھوں میں اشک بھر کر پھر یہ پیام کہنا!

جوش فطرت اور اس کے مختلف مظاہر کے پرستار ہیں۔ چڑیوں کی حرکات و سکنات ہوں یا آسمان پر چھائی ہوئی گھٹا' برسات کی رم جھم ہو یا شفق کا منظر' دیہاتی بہار ہو یا زمین پر موتی بکھیرتی ہوئی آبشار' جوش کے لیے فطرت ایک بے جان شے نہیں بلکہ اس کا زندہ وجود ہے۔ جوش کا عقیدہ ہے کہ جنگل'

گلشن اور فطرت سے جو محبت اور خلوص انسان کو ملتا ہے وہ انسانوں سے نہیں ملتا۔ دوست بے وفا ہو سکتے ہیں لیکن فطرت کبھی بے وفائی نہیں کرتی۔ انسان سے فطرت کی دوستی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

جوش حسن کے عاشق اور دیوانے ہیں۔ یہ حسن فطرت میں ہو یا انسان میں۔ وہ جمال پرست ہیں۔ زندگی کی رعنائیوں سے وہ ایک شاعر، ایک انسان دوست اور ایک مفکر کی حیثیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ حسن کی جلوہ سامانیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

25.3.3 جوش، شاعر حسن و عشق

جوش نے حسن اور عشق کے موضوع پر بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں میں جوش کا تجربہ، مشاہدہ، جذبہ، حسن سے فطری لگاؤ وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہے۔ جوش حسن کو ہر انداز میں ہر رنگ میں دیکھتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی رومانی نظمیں مثلاً 'انتظار کے دن'، 'یہ کون اٹھا ہے شرماتا'، 'اٹھتی جوانی'، 'دوپٹے کو مسلے بدن کو چھپائے'، 'پیغام بہار'، 'امینِ شہاب'، 'اپنی ملکہ سخن سے'، 'شرابِ آغوش'، 'پرتوِ اجسام'، 'جنگل میں منگل'، 'بری ہوئی آنکھیں'، ایسی خوبصورت اور دلآویز رومانی نظمیں ہیں کہ اردو میں ان کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

جوش نے ''گنگا کے گھاٹ پر'' کے عنوان سے ایک رومانی نظم لکھی ہے۔ اس نظم میں ایک ایسی لڑکی کی تصویر کشی ہے جو گنگا کے گھاٹ سے نہا کر آ رہی ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ جوش نے اس نظم میں الفاظ کے جادو سے حسن کی زندہ جاوید تصویر بنا دی ہے۔ نظم کے کچھ اشعار ہیں:

بڑھائے سرخیِ عارض ہوائے صحرا سے — نہایا کون چلا آ رہا ہے گنگا سے
سرا دلائی کا سر پر نظر جھکائے ہوئے — دبائے دانتوں میں آنچل، بدن چرائے ہوئے
دراز زلف میں جادو، سیاہ آنکھ میں مدھ — نسیمِ صبحِ بنارس، ہلالِ شامِ اودھ
مری طرف سے کوئی کاش یوں ہو گرمِ خطاب — کہ وقتِ صبح ہے اے دخترِ شبِ مہتاب
ازل کے دن سے درِ حسن کا بھکاری ہوں — ادھر بھی ایک نظر میں ترا پجاری ہوں

جوش حسن کی دلکشی اور دلآویزی کی تصویر کشی میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ ان کی بعض نظموں کے مطالعے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حسن کی اداکاریوں اور رنگینیوں کو ایک ایسے مصور کی طرح پیش کرتے ہیں جو منظر سے زیادہ اپنی فنی مہارت دکھانے کی زیادہ کوشش کرتا ہے۔ ان کی ایک نظم 'کہستان دکن کی عورتیں' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ ابلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں — سنگِ اسود کی چٹانیں، آدمی کے روپ میں
چال جیسے تند چشمے، تیوریاں جیسے غزال — عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال
یہ جواں چہرے پہ چہروں میں ہے برنائی کا جوش — تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش
دید کے قابل ہے، ان کافر بتوں کا رنگ روپ — کھپ چکی ہے جس میں بارش ڈس چکی ہے جس کو دھوپ
ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی، الاماں — پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں
کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنھیں — آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں
کیا خبر کتنے دنوں کی جوش پامالی ہوئی — ان اداؤں سے کہ طوفان کی ہیں پالی ہوئی

پروفیسر آل احمد سرور نے جوش کی نظم گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ''جوش کی حسن کاری میں کلام نہیں۔ ان کی تشبیہات جاندار، دلکش اور معنی خیز ہوتی ہیں۔ ان کا تخیل لالہ کار ہے مگر دور رس نہیں۔ انسانیت سے اس قدر گہری محبت اور اس کے روشن مستقبل پر یقینِ محکم نے ان کے کلام میں بڑی آب و تاب پیدا کر دی ہے۔''

جوش کسی بھی موضوع پر نظم کہتے ہیں تو الفاظ و بیان پر اپنی قدرت کا پورا استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات نئے نئے الفاظ کے استعمال میں اردو کا کوئی بھی شاعر جوش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. جوش کی نظم نگاری کی خصوصیات لکھیے۔
2. کس نظم کے سلسلے میں جوش کے گھر کی تلاشی لی گئی تھی؟
3. جنگ آزادی کے موضوع پر لکھی جانی والی چند نظموں کے عنوان لکھیے۔
4. جوش کی رومانی نظموں کے بارے میں صرف دو تین جملے لکھیے۔

25.4 جوش کی چند نظمیں

25.4.1 نظم: شکست زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، تو پوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطان کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا اُن کو خبر تھی؟ زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مار سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا ان کو خبر تھی؟ سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا ان کو خبر تھی؟ ہونٹوں پر جو قفل چڑھایا کرتے تھے
ایک روز اُسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو! کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو! کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو! کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو! کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

25.4.2 نظم: بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

وہ سانولے پن پر میدان کی ہلکی سی سیاہی دوڑ گئی
تھوڑا سا ابھر کر بادل سے وہ چاند جبیں جھلکانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا

بادل میں چھپا تو کھول دیے ہیں دل میں دریچے ہیرے کے
گردوں میں جو آیا تو گردوں، دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا تاریکی میں، چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے، امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں سے جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا تو سیاہی دوڑ ا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوش نور و ظلمت ہے؟ کیا قید ہے؟ کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

25.4.3 نظم : کسان

جُھٹپٹے کا نرم رو دریا ، شفق کا اضطراب
کھیتیاں ، میدان ، خاموشی ، غروب آفتاب

دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ

زیر لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعل گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود

وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ

خامشی ، اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گِلا

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتوں کے درمیاں کا فاصلا

خار و خس پر ایک درد انگیز افسانے کی شان
بام گردوں پر کسی کے روٹھ کے جانے کی شان

دوب کی خوشبو میں ، شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل ، زمیں پر تتلیاں ، سر پر طیور

پارہ پارہ ابر ، سرخی ، سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں ، کھویا ہوا سا آسماں

پتّیاں مخمور ، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

.....

یہ سماں اور اک قوی انسان ، یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا ، تہذیب کا پروردگار

طفلِ یاراں ، تاجدارِ خاک ، امیر بوستان
ماہرِ آئینِ قدرت ، ناظمِ بزم جہاں

ناظر گل ، پاسبانِ رنگ و بو ، گلشن پناہ
ناز پرور ، لہلہاتی کھیتوں کا بادشاہ

وارث اسرارِ فطرت ، فاتح امید و بیم
محرمِ اسرارِ باراں ، واقف طبع نسیم

صبح کا فرزند ، خورشید زر افشاں کا علم
محنت پیہم کا پیماں ، سخت کوشی کی قسم

جلوۂ قدرت کا شاہد ، حسن فطرت کا گواہ
ماہ کا دل ، مہر عالمتاب کا نورِ نگاہ

قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام
منکشف جس کی فِراست پر مزاجِ صبح و شام

خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے ہے جاں پرور گلاب

قلب آہن جس کے نقش پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلہ خو ، جھونکوں کا ہمدم ، تیز کرنوں کا رفیق

خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں بازیاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہ آفتاب

لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

جس کی جاں کاہی سے پکاتی ہے امرت نبضِ تاک
جس کے دم سے لالہ وگل بن کے اتراتی ہے خاک

سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ

خونِ جس کا دوڑتا ہے ، نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں

جس کے ماتھے کے پسینے سے ، پے عز و وقار
کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے بھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو' کی نزاکت پر صلابت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منھ' گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر پر' بغل میں پھاوڑا' تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی' دوش پر مضبوط ہل

.....

کون ہل ؟ ظلمت شکن' قندیلِ بزم آب و گل
قصرِ گلشن کا دریچہ' سینۂ گیتی کا دل

خوشنما شہروں کا بانی' راز فطرت کا سراغ
خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ

دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شامِ زیرِ ارض کو' صبحِ درخشاں کا پیام

ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذروں کی موسیقی کو چمکاتا ہوا

جس کے چھو جانے سے مثلِ نازنین مہہ جبین
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

پردہ ہائے خواب ہوجاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو الٹ دیتی ہے خاک

جس کی تابش میں درخشانی ہلال عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی

جس کا مس خاشاک میں بنتا ہے اک چادر مہیں
جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمیں

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سرجھکائے گھر کی جانب رواں

اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
جن میں آجاتی ہے تیزی کھیتوں کو روند کر

اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے
دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیِ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ

پھر رہا ہے خوں چکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی نا امید دیوی کا شباب سوگوار

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا ؟
بے ردا بیوی کا سر' بچوں کا منھ اترا ہوا

سیم و زر نان و نمک' آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

.....

ایک دل' اور یہ ہجومِ سوگواری ہائے ہائے !
یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے !

تیری نظروں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار

بے کسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ
کیا چبا ڈالے گی او کم بخت ! ساری کائنات

ظلم اور اتنا ! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی ؟
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی

دیکھ کر تیرے ستم' اے حامیِ امن و اماں
گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دباکر انگلیاں

ادعائے پیرویِ دین و ایماں اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں' سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب میں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لیے بے تاب ہیں

25.5 چند اشعار کی تشریح

شکست زنداں کا خواب

کیا ان کو خبر تھی ؟ سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے — اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی ؟ ہونٹوں پر جو قفل چڑھایا کرتے تھے — اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو! کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو! کہ وہ قیدی چھوٹ گئے — اٹھو! کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو! کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

جوش کی ایک نظم ''شکست زنداں کا ایک خواب'' ہے اس نظم کا شمار اردو کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔ نظم میں انقلاب کی گھن گرج سنائی دیتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستانی برطانوی حکومت کے خلاف شعلے برسا رہے ہیں۔ پہلے شعر میں جوش کہتے ہیں کہ برطانوی حکومت، ہندوستانیوں کے سینے سے خون چراتی تھی۔ ان پر اتنا ظلم کرتی تھی کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے قابل نہ رہیں لیکن انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ جب ظلم کی انتہا ہو جاتی ہے تو مظلوم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھا لیتے ہیں۔ ایک وقت وہ تھا جب برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کے سینے سے سارا خون چرا لیا تھا اور اب اسی بے رنگی سے ہزاروں تصویریں بن رہی ہیں۔ یعنی ظلم برداشت کرنے والے اب ہاتھوں میں ہتھیار لے کر میدانوں میں اتر آئے ہیں۔ دوسرے شعر میں جوش کہتے ہیں کہ برطانوی سامراج نے اپنی طاقت کے بل پر مظلوم ہندوستانیوں کے ہونٹوں پر تالے ڈال رکھے تھے۔ ہندوستانی حکومت کے سارے ظلم وستم برداشت کر رہے تھے اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اب ہر طرف حکومت کے خلاف عوام ایسی تقریریں کر رہے ہیں جن سے شعلے برس رہے ہیں۔ گویا خاموشی سے ظلم سہنے والے اب بغاوت پر اتر آئے ہیں۔

تیسرے شعر میں جوش انقلاب کی وہ تصویریں کھینچتے ہیں جس میں قیدی اپنا حق لینے کے لیے موت سے ٹکر لینے کے لیے تیار ہیں۔ جوش برطانوی حکومت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم نے جس قید خانے میں اپنے غلاموں کو ڈال رکھا تھا اب وہ انقلاب کی صداؤں سے گونج رہا ہے۔ اگر سنبھل سکتے ہو تو سنبھل جاؤ۔ اب قیدی قید خانوں کی دیوار توڑ کر باہر آ رہے ہیں۔ تم نے اپنے غلاموں کے پیروں میں زنجیریں ڈالی تھیں وہ ٹوٹ رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب جنگ آزادی کے مجاہد ظلم وستم کے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں اور اب تمہاری غیر معمولی طاقت بھی انہیں آزاد ہونے سے نہیں روک سکتی۔

بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا ظلمت کا نشاں لہرانے لگا — مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا
وہ سانولے پن پر میداں کی ہلکی سی سیاہی دوڑ گئی — تھوڑا سا ابھر کر بادل سے وہ چاند جبیں جھلکانے لگا
لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے — لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا

جوش ملیح آبادی کو منظر نگاری پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ جس کی اردو میں مشکل ہی سے کوئی مثال ملے گی۔ ان کی ایک نظم 'بدلی کے چاند' کے مذکورہ بالا تین اشعار ہیں:

پہلے شعر میں جوش سورج ڈوبنے کا منظر پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دیکھو سورج ڈوب گیا ہے اور دنیا پر اندھیرا چھا رہا ہے۔ چاند ہلکے بادلوں سے اس طرح اپنی کرنیں بکھیر رہا ہے معلوم ہوتا ہے جیسے چاند بادلوں میں سے چاندی کے ورق برسا رہا ہے۔ بادلوں میں جھانکتی ہوئی چاندنی کی کرنیں ایسی لگتی ہیں جیسے بادلوں میں سے چاندی کے ورق برسائے جا رہے ہوں۔ جوش نے اپنے خاص لہجے میں شام کے وقت کی بڑی خوبصورت تصویر پیش کی ہے

دوسرے شعر میں جوش کہتے ہیں کہ شام کا وقت ہے اور میدانوں کا رنگ سانولا ہے اور شام ہونے کی وجہ سے میدان پر ہلکی سی سیاہی کی چادر بچھ گئی ہے۔ اس فضا میں چاند بادل سے ایسے جھانک رہا ہے جیسے کالی چادر میں سے کسی حسین کا ماتھا چمکتا ہوا دکھائی دے۔

تیسرے شعر میں کہیں کہیں چاند کی روشنی کے خطوط نظر آتے ہیں اور پھر گھٹا چھٹنے لگی اور چاند اس طرح باہر آ گیا کہ اندھیرے کے قدم ڈگمگانے لگے یعنی اندھیرا غائب ہونے لگا۔

کسان

جس کے ماتھے کے پسینے سے، پےِ عز و وقار　　کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی　　جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جوش کی ایک نظم ہے 'کسان'۔ یہ نظم خاصی طویل ہے۔ اس نظم کے تین شعر وہ ہیں جو اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ اس نظم میں جوش نے کسان کی محنت اور جدوجہد کو اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ کسان ہمیں 'تاجدارِ خاک'، 'ارتقا کا پیشوا'، 'تہذیب کا پروردگار اور اس دنیا کو چلانے والا نظر آتا ہے۔ عام آدمی کی نظر میں کسان ایک جاہل انسان ہے، جس کا کام صرف دوسروں کے لیے خون پسینہ بہانا ہے، جس کی محنت کے بل پر بڑے بڑے محل تعمیر ہوتے ہیں، جس کا پسینہ دولت مندوں کے لیے عیش وعشرت کا سامان تیار کرتا ہے۔ جوش کہتے ہیں کسان کے ماتھے کا پسینہ قابل احترام ہے، کیونکہ بادشاہ اور دولت مند لوگ عزت اور وقار حاصل کرنے کے لیے اس سے بھیک مانگتے ہیں۔

دوسرے شعر میں وہ کہتے ہیں: یہ کسان ہی ہیں جن کے دم سے اور طاقت سے تباہی و بربادی کی قوتیں دبی رہتی ہیں اور یہ کسان ہی ہے جو ہماری تہذیب وتمدن کو زندہ رکھتا ہے۔ یہ کسان ہی ہیں جن کی محنت کی وجہ سے عیش وآرام کی زندگی گزارتے ہیں۔ اگرچہ کسانوں پر ظلم وستم ہوتا ہے لیکن وہ اپنی محنت سے اناج پیدا کرتے ہیں۔ وہ اناج جو ہماری زندگیوں کا ضامن ہے اور اس اناج سے ہمیں وہ دولت حاصل ہوتی ہے، جس کی وجہ سے ہماری تہذیب و تمدن قائم ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. شکست زنداں کا خواب کا موضوع کیا ہے؟
2. ''مہتاب ہلکے بادلوں سے چاندی کے ورق برسانے لگا۔'' یہاں چاندی کے ورق سے کیا مراد ہے؟
3. ''ظلمت کے قدم تھرانے لگے'' کا مطلب کیا ہے؟
4. نظم ''کسان'' میں کسان کیسا نظر آتا ہے؟
5. تہذیب وتمدن میں کسان کی کیا اہمیت ہے؟

25.6 خلاصہ

درۂ خیبر میں ایک سردار تھے یار بیگ خاں جن کے دو بیٹے تھے محمد نامدار خاں اور محمد بلند خاں۔ محمد بلند خاں کے دو بیٹے تھے۔ محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں۔ محمد بلند خاں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ ہندوستان آ گئے اور قائم گنج ضلع فرخ آباد میں انہوں نے سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصے بعد محمد بلند خاں اودھ کے نواب غازی الدین حیدر کے پاس چلے گئے جہاں نواب نے انہیں اپنی فوج میں تین سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ محمد بلند خاں کے دوسرے بیٹے فقیر محمد خاں بڑے بہادر اور عالم وفاضل تھے۔ جوش نے ان کے حالات اپنی کتاب 'یادوں کی برات' میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہ شاعر بھی تھے اور جوش کے دادا تھے۔

جوش کے والد نواب بشیر احمد خاں شاعر تھے اور بشیر تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے زندگی بھر ملازمت نہیں کی۔ اردو ان کی مادری زبان تھی اور فارسی پر انہیں بہت قدرت حاصل تھی۔ سعدیؔ، حافظؔ، فردوسیؔ کا پورا کلام انہیں یاد تھا۔

وہ پہلے مرزا داغؔ کے شاگرد ہوئے۔ بعد میں انہوں نے امیر مینائی اور جلالؔ لکھنوی کا تلمذ اختیار کیا۔ جوش 5 دسمبر 1898ء کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم ختم ہونے کے بعد انہیں مزید تعلیم کے لیے سیتا پور بھیج دیا گیا، جہاں انہیں فرنچ ایچ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد

والد نے جوش کو سیتا پور سے بلا کر لکھنؤ کے جوبلی ہائی اسکول میں داخل کر دیا پھر انہوں نے لکھنؤ کے چرچ مشن اسکول اور ریڈ کرسچین کالجیٹ اسکول میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے جوش علی گڑھ گئے۔ شرارتوں کی وجہ سے انہیں کالج سے نکال دیا گیا اور آگرے آ گئے جہاں انہوں نے پیٹرز کالج میں سینئر کالج تک تعلیم پائی۔ نو برس کی عمر میں جوش نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ جوش کے والد نہیں چاہتے تھے کہ وہ شاعری کریں۔ اس لیے جوش چوری چھپے شعر کہتے تھے مگر کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ والد نے جوش کو شعر گوئی کی اجازت دے دی۔

والد کے انتقال کے بعد جوش شعر و شاعری میں ایسے مصروف ہوئے کہ ملازمین نے ان کی جائیداد کا بہت بڑا حصہ غصب کر لیا۔ جب جوش کو ہوش آیا تو ان کے پاس کچھ باقی نہیں تھا۔ مجبوراً انہیں ملازمت کی تلاش میں حیدرآباد جانا پڑا' جہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں مترجم کے طور پر ان کا تقرر ہو گیا۔ سات آٹھ سال تک جوش حیدرآباد میں رہے۔ ان کی ایک نظم پر حیدرآباد کے نواب میر عثمان علی خان ایسے ناراض ہوئے کہ انہوں نے جوش کو حیدرآباد چھوڑنے کا فرمان صادر کر دیا۔ اس کے بعد جوش نے فلموں میں کام کیا اور پھر ماہانہ 'آج کل' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد پاکستان چلے گئے۔ جہاں ان کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ 22 فبروری 1982 کو ان کا اسلام آباد میں انتقال ہو گیا۔

جہاں تک انقلابی شاعری کا تعلق ہے کہا جاتا ہے کہ جنگ آزادی کی جدوجہد میں جوش سے زیادہ کسی نے فکر انگیز اور شعلہ انگیز نظمیں نہیں کہیں۔ جوش نے اپنی انقلابی شاعری میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کے شعلے اگلے ہیں۔ ان کی نظموں سے مجاہدوں کی ہمت بڑھتی تھی اور برطانوی حکومت سے ٹکر لینے کا حوصلہ ہوتا تھا۔ جوش کا دوسرا موضوع فطرت نگاری تھا۔ جوش کو فطری مناظر بہت پسند تھے۔ اردو میں فطرت نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ جوش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے فطرت نگاری کے فن کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔ جوش کا مشاہدۂ فطرت بہت وسیع اور گہرا تھا۔ وہ فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے تھے اور فطرت کی ہر شئے اور ہر منظر میں ایسا حسن دیکھتے تھے اور ایسی لطافت پاتے تھے جس سے دل و دماغ کو فرحت اور سرور حاصل ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کے بعد جوش وہ واحد شاعر ہیں جنہیں زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ منظر کشی میں خوبصورت استعاروں' نادر تشبیہوں اور اچھوتے تخیل سے کام لے کر کسی بھی منظر کو زندہ جاوید کر دیا کرتے تھے۔

پروفیسر آل احمد سرورؔ نے جوش کی نظم گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ جوش کی حسن کاری میں کلام نہیں۔ ان کی تشبیہات جاندار' دلکش اور معنی خیز ہوتی ہیں۔ ان کا تخیل لالہ کار ہے مگر دور رس نہیں۔ انسانیت سے اس قدر گہری محبت اور اس کے روشن مستقبل پر یقین محکم نے ان کے کلام میں بڑی آب و تاب پیدا کر دی ہے۔

جوش کسی بھی موضوع پر نظم کہتے ہیں تو الفاظ و بیان پر اپنی قدرت کا پورا استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات نئے نئے الفاظ کے استعمال میں اردو کا کوئی بھی شاعر جوش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

25.7 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس سطروں میں دیجیے۔

1. جوش کی تعلیم اور ابتدائی زندگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. پاکستان میں جوش کے حالات پر ایک مضمون لکھیے۔
3. نظم میں جوش کے موضوعات کیا کیا تھے؟

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. جوش کے آباواجداد ہندوستان کہاں سے آئے تھے؟ اور پہلے انہوں نے کس شہر میں سکونت اختیار کی؟
2. جوش کی ولادت کب اور کس شہر میں اور وفات کب اور کس شہر میں ہوئی؟
3. جوش کے والد کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔
4. ٹیگور سے جوش کے مراسم کس طرح کے تھے؟
5. حیدرآباد میں جوش کی مصروفیات کا جائزہ لیجیے۔

25.8 فرہنگ

الفاظ = معنی

شکستِ زنداں کا خواب

تلاطم = موجوں کا زور۔طوفان، تھپیڑے مارنا
تخریب = بربادی، تباہی، خرابی

بدلی کا چاند

خورشید = سورج
گرداب = بھنور
کاوش = تلاش۔جستجو۔تحقیق کرنا

کسان

ارض = زمین
قطع کرنا = کاٹنا، تراشنا، طور۔طریق
طیور (طائر کی جمع) = پرندے
آئین = قانون۔قاعدہ
رقیق = پتلا۔نرم۔ملائم
افلاک (فلک کی جمع) = آسمان
تاک = انگور کی بیل۔ٹہنی۔گھات لگانا
تابشِ کلاہ تاجدار = بادشاہ کے تاج کی چمک
قصر = محل
مضمحل = کمزور۔دبلا۔پتلا۔رنجیدہ
بے ردا = بغیر چادر۔اوڑھنی کے بغیر
شرار = چنگاری
ادعا = دعویٰ کرنا۔بے دلیل بات کہنا

شعاعِ امید

پہنائے فضا = فضا کی وسعت
آفاق = دنیا
مہرِ جہاں تاب = دنیا کو روشن کرنے والا سورج

الفاظ = معنی

ظلمت = تاریکی، آندھیرا
غرفہ = کھڑکی، دریچہ، بالا خانہ
نور و ظلمت = روشنی اور اندھیرا
سما = آسماں
خار و خس = کانٹے اور گھاس پھوس
ارتقا = بتدریج ترقی کرنا
ناظم = انتظام کرنے والا
خاشاک = کوڑا کرکٹ
جاں کاہی = سخت محنت
عز و وقار = عزت و مرتبہ
سرنگوں = سر کے بل۔اوندھا۔شرمندہ
سینۂ گیتی = دنیا کا سینہ
حرماں = ناامیدی۔مایوسی۔بدقسمتی
غلطاں = گول، لڑھکتا ہوا۔گرتا پڑتا
گرگ = بھیڑیا
بے مہری = بے رخی۔بے توجہی
افرنگ = انگریز۔یورپ کا باشندہ
خزف ریزہ = کنکر۔ٹھیکری

الفاظ = معنی

زنداں = قیدخانہ
تنکی = ہوا کا ہلکے ہلکے چلنا
ضیا = روشنی۔چمک
افسردہ = مرجھایا ہوا، اداس، غمگین
دُوب = نرم اور عمدہ گھاس
تاج دار = بادشاہ
قلبِ آہن = لوہے کا دل
کلاہِ آفتاب = سورج کی پگڑی
تابانی = روشنی۔چمک
دریوزہ = فقیری۔بھیک
صلابت = مضبوطی۔سختی
درخشانی = چمک دمک
خوں چکاں = خون ٹپکتا ہوا
شقاوت = سنگ دلی۔بدبختی
زہرہ آب ہونا = حوصلہ پست ہونا

طَوف = طواف کرنا۔گرد پھرنا
سیماب = پارہ

25.9 سفارش کردہ کتابیں

1. جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، دہلی، 1988
2. فضل امام ڈاکٹر شاعرِ آخر الزماں، جوش ملیح آبادی، دہلی 1982
3. عقیل احمد ڈاکٹر جوش کی شاعری کا تنقیدی جائزہ
4. ماہنامہ ساقی، جوش نمبر، کراچی
5. ماہنامہ افکار جوش نمبر، ساقی
6. خلیق انجم (مرتب) جوش ملیح آبادی، تنقیدی جائزہ، دہلی، 1992

اکائی: 26 فیضؔ: حیات، کارنامے اور نظم نگاری

ساخت

26.1 تمہید

26.2 حیات

26.3 کارنامے

26.4 نظم نگاری

26.4.1 اسلوب سخن

26.5 نظم: مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

26.5.1 نظم مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ کا تجزیہ

26.6 نظم: نثار میں تیری گلیوں کے.....

26.6.1 نظم: نثار میں تیری گلیوں کے..... کا تجزیہ

26.7 نظم: شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

26.7.1 نظم: شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کا تجزیہ

26.8 خلاصہ

26.9 نمونہ امتحانی سوالات

26.10 فرہنگ

26.11 سفارش کردہ کتابیں

26.1 تمہید

فیض احمد فیضؔ عصر جدید کے مقبول شاعر ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعر ہیں۔ اس اکائی میں فیض احمد فیض کے حالات زندگی، کارنامے نظم نگاری کی خصوصیات اور منتخب نظموں کی تشریح کا مطالعہ کریں گے۔

26.2 حیات

فیض احمد فیضؔ کا نام فیض احمد خاں تھا۔ پردادا کا نام سربلند اور دادا کا نام صاحب زادہ خاں تھا۔ فیضؔ کی بہن بی بی گل کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں ایک راج پوت رلجہ ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام سین پال تھا اور اس کا تعلق سہارن پور سے تھا۔ اس کی اولاد میں سے ایک نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کے والد کا تعلق اسی شاخ سے ہے۔ فیض کے والد کا نام سلطان بخش تھا لیکن انھوں نے خود اپنا نام بدل کر سلطان محمد خاں کرلیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ سلطان محمد خاں نے افغانستان میں 13 برس ملازمت کی اور امیر عبدالرحمٰن کی بھتیجی اور سردار محمد رفیع خاں کی بیٹی سائر خاں سے شادی کی لیکن شادی کے دو سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ سلطان محمد خاں شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی بھانجی ڈاکٹر مس ہملٹن نے اپنے ایک ناول میں ان کا ذکر کیا ہے۔ افغانستان سے آنے کے بعد سلطان محمد خاں نے لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور سیال کوٹ کے مشہور بیرسٹر بن گئے۔ علامہ اقبالؔ، سر عبدالقادر، ڈاکٹر ضیاالدین، علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ادبی شخصیتوں کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا تھا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر، انجمن اسلامیہ

سیال کوٹ کے صدر، اور انجمن حمایت الاسلام کی انتظامیہ کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے افغانستان کے دستوری قوانین اور امیر عبدالرحمٰن کی سوانح عمری انگریزی میں لکھی تھی۔ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد انھوں نے عدالت خاں کی صاحبزادی سلطان فاطمہ سے دوسری شادی کی۔ فیض ان ہی سے پیدا ہوئے۔ اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں فیض کہتے ہیں۔

''تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں 7 جنوری 1911ء اور کہیں 7 جنوری 1912ء درج ہے۔ سیال کوٹ کے دفتر بلدیہ کے ریکارڈ میں 13 فروری 1911ء تاریخ پیدائش درج ہے۔''

فیض قصبہ قادر، ضلع سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے زمانے میں فیض نے بڑی خوش حال زندگی گزاری۔ فیض نے اپنی تعلیم کا آغاز 1915ء میں چار سال کی عمر میں قرآن پاک کے حفظ سے کیا۔ (صرف تین پارے حفظ کر سکے آنکھیں دکھنے لگیں تو حفظ کرنا چھوڑ دیا) 1916ء میں مولوی ابراہیم سیال کوٹی کے مکتب میں بٹھا دیے گئے جہاں انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ 1921ء میں لاہور کے ایک مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ 1927ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ 1929ء میں مرے کالج آف سیال کوٹ سے انٹرمیڈیٹ بھی درجہ اول سے کامیاب کیا۔ 1931ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور عربی میں بی۔ اے آنرز کیا۔ اس کے بعد 1933ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔ اے اور 1934ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم۔ اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ اس طرح فیض کا پورا تعلیمی کیریر فرسٹ کلاس ہے۔ والد کے کہنے پر آئی۔ سی ایس کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ امتحان سے پہلے انھیں ہیضہ ہو گیا۔ اس لیے امتحان نہ دے سکے۔ 1934ء میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔ 1935 میں امرتسر کے مسلم اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔ اے۔ او) میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر ہوا۔ 1940ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔

فیض احمد فیض نے ایک انگریز خاتون مس ایلیس جارج سے باقاعدہ اسلامی طریقے سے شادی کی۔ ایلیس جارج، کرسٹابیل کی چھوٹی بہن تھیں۔ کرسٹابیل ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی بیوی تھیں جو ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل تھے۔ شیخ عبداللہ نے مہاراجہ کشمیر کے محل میں ان کا نکاح پڑھوایا۔ فیض کی شادی عجیب ڈھنگ سے کشمیر میں ہوئی۔ بارات میں صرف دو آدمی تھے۔ فیض کے بڑے بھائی طفیل احمد خاں اور فیض کے ایک دوست نعیم۔ نکاح کے بعد بیگم و شیخ عبداللہ نے دلہا دلہن کی دعوت کی، دعوت کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں جوشؔ اور مجازؔ نے شرکت کی۔ تین دن قیام کے بعد فیض اور ان کی بیگم لاہور آ گئے۔ فیض کے والد نے ایلس کو باضابطہ دلہن بنایا اور ان کا نام کلثوم رکھا۔ فیض کی اولاد میں دو لڑکیاں ہیں۔ پہلی بیٹی سلیمہ 1942ء میں اور چھوٹی بیٹی منیرہ 1945ء میں پیدا ہوئیں۔

1942ء میں درس و تدریس کے پیشے کو خیرباد کہا اور فوج میں ملازمت اختیار کی۔ کیپٹن کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ وہ لاہور سے دہلی آ گئے۔ ان کا تعلق فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے تھا۔ 1943ء میں میجر اور 1944ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1947ء میں فوج سے استعفیٰ دے کر لاہور چلے گئے۔ یہاں انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر اور ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔

قیام پاکستان کے تقریباً تین برس بعد 1951ء میں لیاقت علی خاں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے فوجی افسر اور ترقی پسند تحریک کی اہم شخصیت سجاد ظہیر بھی گرفتار ہو گئے۔ یہ کیس ''راول پنڈی سازش مقدمہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ فیض نے چار سال ایک ماہ گیارہ دن قید کی صعوبتیں اٹھائیں۔ تقریباً تین مہینے قید تنہائی کی سزا ہوئی۔ فیض کی بیشتر نظمیں ان کے زمانہ قید کی یادگار ہیں۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زبان میں نے

20 اپریل 1955ء کو قید سے رہا ہوئے۔ دوسری بار 1958ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور اپریل 1959ء میں رہائی ملی۔ اپریل

1959ء میں ہی فیض پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس خدمت پر وہ جون 1962ء تک فائز رہے۔ اس کے بعد وہ لندن چلے گئے۔ 1964ء میں فیض سر عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ستمبر 1968ء میں کراچی میں ادارہ یادگار غالب قائم کیا اور علامہ اقبال پر فلم بنائی۔ 1972ء میں فیض پاکستانی قومی ادبی اکیڈیمی کے صدر مقرر ہوئے۔ 1979ء میں بیروت کے انگریزی رسالے ''لوٹس'' کے ایڈیٹر بنے۔ 1981ء میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر جشن فیض منایا گیا۔ 1984ء میں لندن میں فیض سیمینار ہوا جس میں فیض بذاتِ خود شریک ہوئے۔

19 نومبر 1984ء کو ان پر دمے کا شدید دورا پڑا۔ انھیں لاہور کے ماؤ ہاسپٹل میں داخل کیا گیا جہاں ایسٹ میڈیکل وارڈ میں 20 نومبر 1984ء بروز منگل دن میں ایک بج کر پندرہ منٹ پر ان کا انتقال ہوگیا۔ لاہور کے ماڈل ٹاون قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ فیض کی تقریباً پندرہ شعری و نثری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

شعری مجموعے

(1) نقش فریادی (1941) (2) دست صبا (1952) (3) 'زنداں نامہ (1956) (4) دست تہہ سنگ (1965) (5) سرِ وادی سینا (1971) (6) شام شہر یاراں (1978) (7) میرے دل میرے مسافر (1981) (8) کلام فیض (1982) (9) سارے سخن ہمارے (فیض کا تمام کلام ''کلیات'' کی صورت میں لندن سے شائع ہوا) (1984) (10) نسخہ ہائے وفا (سارے سخن ہمارے کا پاکستانی ایڈیشن) 1984

نثری مجموعے

(1) میزان (تنقیدی مضامین) 1962 (2) صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط) 1971 (3) متاع لوح و قلم (1973) (4) ہماری قومی ثقافت (1976) (5) مہ و سال آشنائی (1980) (6) سفرنامہ کیوبا (1974)

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فیض کی صحیح تاریخ پیدائش کیا ہے؟
2. فیض کا مقام پیدائش (1) سیالکوٹ (2) کراچی (3) جالندھر
3. فیض کی پندرہ تصانیف میں سے دو شعری مجموعوں کے نام لکھیے۔

26.3 کارنامے

فیض تعلیم ختم کرنے کے بعد جب امرتسر آئے تو ان کی ملاقات پطرس بخاری، رشید جہاں، ہاجرہ بیگم، ڈاکٹر محمود الظفر اور دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں سے ہوئی۔ فیض اپنے پہلے عشق میں ناکام ہو کر بہت دل برداشتہ تھے۔ رشید جہاں نے اسے محسوس کیا اور کہا کہ یہ حادثہ تمہاری ذاتِ واحد کا بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے مگر یہ اتنا بڑا نہیں ہو سکتا کہ زندگی بے معنی ہو جائے۔ انھوں نے فیض کو پڑھنے کے لیے ایک کتاب دی جو کارل مارکس کی تھی۔ بقول فیض 'انھوں نے اس کتاب کو پڑھا اور ان پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اشتراکی ادب کے مطالعے نے انھیں سوشلزم کی طرف مائل کیا۔ فیض نے ان لوگوں کے ساتھ مل کر ریلوے اور ڈاک و تار کے مزدوروں کو منظم کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد فیض ٹریڈ یونین کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ سجاد ظہیر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں حصہ لیا۔ فیض نے جینوا اور سان فرانسسکو میں منعقدہ آئی۔ ایل۔ او کے اجلاس میں شرکت کی۔ فیض نے اپنے ملکی مسائل کے علاوہ فلسطین مہاجرین اور افریقی عوام کی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ فیض کا تعلق فلموں سے بھی رہا۔ انہوں نے دو فلموں کے لیے گانے اور مکالمے لکھے۔ ایک فلم ''جاگو ہوا سویرا'' جو 1959ء میں نمائش کے لیے پیش ہوئی اس فلم کو بین الاقوامی اعزاز بھی مل چکا ہے۔

فیض نے ایشیا اور یورپ کے بہت سے ممالک کے دورے کیے 49-1948 تک سان فرانسسکو اور جینوا میں رہے۔ جولائی 1962ء سے جنوری 1964ء کے دوران انگلستان، روس، الجیریا، مصر، لبنان اور ہنگری کا سفر کیا۔ 1958ء میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی پہلی کانفرنس تاشقند میں ہوئی جس میں فیض صاحب نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔

فیض کو فوجی ملازمت کے دوران 1946ء میں ایم۔ بی۔ ای کا خطاب ملا۔ 1962ء میں فیض کو پہلا لینن انعام ملا۔ فیض پہلے ایشیائی شاعر تھے

جنھیں یہ اعزاز دیا گیا۔اس سے فیضؔ کو نہ صرف بین الاقوامی شہرت ملی بلکہ اردو زبان کا وقار بھی بلند ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. امرتسر میں فیض کی ملاقات کن شخصیتوں سے ہوئی ؟
2. فیض نے کس فلم کے گانے لکھے؟
3. فیض پہلے ایشائی شاعر تھے جنھیں یہ اعزاز دیا گیا۔

(1) نوبل انعام (2) لینن انعام (3) ہلال پاکستان

26.4 نظم نگاری

1928ء میں جب فیضؔ بی۔اے فرسٹ ایر میں تھے شعر کہنے لگے تھے۔مرے کالج سیال کوٹ کے لکچرر محمد سلیم چشتی جو اقبالؔ کے ہم عصر تھے' بی۔اے کے طلبا کو اردو پڑھاتے تھے۔چشتی صاحب نے ایک گروپ ''اخوان الصفا'' کے نام سے بنایا تھا جس کے زیر اہتمام ہر ماہ کالج میں ایک محفل شعر منعقد کی جاتی تھی۔اس کے پہلے مشاعرے کے لیے یہ مصرع طرح تجویز کیا گیا تھا۔ع غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا

نومبر 1928ء کے پہلے ہفتے میں منعقد ہونے والی اس پہلی محفل میں فیضؔ نے پہلی بار غزل پڑھی۔

لب بند ہیں ساقی میری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہوتا

یہ شعر کافی مقبول ہوا۔ان کی پہلی نظم ''میرے معصوم قاتل'' گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین' دسمبر 1929ء میں شائع ہوئی۔اس کے بعد ان کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا۔فیضؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''نقش فریادی'' 1941ء میں شائع ہوا۔اس میں فیضؔ نے دیباچے میں اعتراف کیا:

> ''اس مجموعہ کی اشاعت ایک طرح کا اعتراف شکست ہے۔شاید اس میں دو چار نظمیں قابل برداشت ہیں لیکن دو چار نظموں کو کتابی صورت میں شائع کروانا ممکن نہیں تھا۔اصولاً مجھے انتظار کرنا چاہیے تھا کہ ایسی نظمیں کافی تعداد میں جمع ہو جائیں لیکن یہ انتظار کچھ عبث معلوم ہونے لگا۔''

لیکن یہ بات فیضؔ نے اپنے انکسار کی وجہ سے کہی تھی۔ان کا پہلا مجموعہ کافی مقبول ہوا۔اس پر انھوں نے ن۔م۔راشد سے مقدمہ لکھوایا تھا۔راشدؔ نے لکھا تھا:

> ''نقش فریادی ایک ایسے شاعر کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔''

ن۔م۔راشدؔ کا یہ جملہ فیضؔ کی شاعری کا ''سرنامہ'' ثابت ہوا۔

فیض کی شاعری میں رومان وحقیقت کی دھوپ چھاؤں ابتدا سے انتہا تک موجود ہے۔ان کی شاعری میں حسن ومحبت کی دل گداز داستانیں بھی ہیں اور بیزار نگاہوں کی تلخی بھی۔ان میں حسن کی رنگینی میں کھو جانے کی جرات بھی ہے اور اجنبی ہو جانے کی تمنا بھی ہے۔یہ اپنے عہد سے مایوس ہیں لیکن شکست خوردہ نہیں۔ان کی شاعری میں تفکر آمیز تجسس ہے۔وہ جانتے ہیں کہ غلامی کا یہ اندھیرا چند روزہ ہے۔اس کے لیے وہ ہر ستم سہنے کے لیے تیار ہیں۔فیضؔ کے مزاج میں رومانیت ہے۔یہ رومانیت انھیں خالص انقلابی بننے سے روکتی ہے۔ان کی انقلابیت میں رومانیت کے عناصر شامل ہوتے رہے اور اسی لیے وہ رومان اور حقیقت کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔فیضؔ نے اپنی زندگی میں محبت کی تھی اور ناکام ہوئے تھے۔ان کا محبوب ان کی مختلف نظموں اور غزلوں سے جھلکتا رہا۔

فیضؔ کی نظموں میں یہ محبوب بار بار نظر آتا ہے لیکن یہ خیالی اور تصوراتی محبوب نہیں ہے بلکہ جیتا جاگتا محبوب ہے جس سے انھوں نے بے پناہ پیار کیا تھا۔یہ محبوب متوسط طبقے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ کسی اونچے گھرانے سے متعلق ہے۔فیضؔ انتظار کرواتے نہیں بلکہ انتظار کرتے ہیں۔فیضؔ کی ابتدائی

شاعری میں تنہائی اور انتظار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیضؔ کی روح تنہائی کا شکار ہے۔ وہ گردوپیش کے ماحول کو اکتائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اُن کا دل اچاٹ ہے، وہ پرانی زوال پذیر قدروں سے مایوس ہیں۔ انھیں انتظار ہے۔ اپنے محبوب کا، کسی رنگین آنچل کا، گھنے درختوں پہ سوئی ہوئی چاندنی کا اور عہدِ نو کا جس پر ان کا یقین ہے۔ ان کی تنہائی لمحہ بہ لمحہ بوجھل ہوتی جاتی ہے لیکن وہ مایوس نہیں ہیں۔ یہ نظمیں اپنا ایک انفرادی وجود رکھتے ہوئے بھی ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ نقشِ فریادی کی پہلی نظم ''خدا وہ وقت نہ لائے'' میں بھی انتظار ہے۔ وہ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں:

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے

اور آخر میں

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے
وہ دل کہ بیقرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

اس نظم میں فیضؔ اپنے محبوب کو آنے والے وقت کا خوف بھی دلاتے ہیں اور اپنے دل کی بے قراری کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ فیضؔ کی شاعری میں فراق اور جدائی کا سوز گھلاوٹ اور لذت ہے۔ فیضؔ کے انتظار میں درد کی کسک ہے، امید کی ٹیسیں ہیں۔ فیضؔ کی شاعری میں تنہائی اور انتظار مختلف روپ اختیار کرتے ہیں۔

ان نظموں کی ایک خاص فضا ہے۔ ایک غم انگیز خامشی ہے۔ فیضؔ کی شاعری کا سارا حسن فضا سے جھلکتا ہے۔ وہ ایک ایسی فضا کی تعمیر کرتے ہیں جہاں مصرعوں کی معنویت اہم نہیں رہ جاتی۔ اس فضا میں الفاظ موم کی طرح پگھل کر بہنے لگتے ہیں۔ ایک سناٹا سا محسوس ہوتا ہے اور تنہائی روح کی گہرائیوں میں اترتی محسوس ہوتی ہے اور سارا وجود سراپا انتظار بن جاتا ہے۔ فیضؔ نے دو نظمیں ''تنہائی'' اور ''انتظار'' کے عنوان سے لکھی ہیں۔

نظم ''انتظار'' میں وہی اشتیاق ہے جو ہر شاعر کو اپنی محبوبہ کا ہوتا ہے۔ اس نظم میں وہ کوئی خاص فضا نہیں بنا سکے۔ صرف اپنے عام احساسات کا اظہار کرتے ہیں:

جو حسرتیں تیرے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں

نظم کے اختتام پر ایسا لگتا ہے جیسے شاعر بہت تھک کر نڈھال ہو گیا ہو۔ ایک خود سپردگی کی کیفیت، شکست کا اعتراف اور ملتجیانہ انداز ابھر کے آتا ہے:

قسم تمھاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویِ صبر و شکیب آ جاؤ
قرارِ خاطرِ بے تاب، تھک گیا ہوں میں

نظم ''تنہائی'' معنوی اور فنی اعتبار سے فیضؔ کی اہم نظم ہے۔ یہ نظم داخلیت کا اظہار ہے۔ یہ نظم آرتھر سائمن کی Broken Trust یا ہارڈی کی نظم The Broken Appointment کی یاد دلاتی ہے۔ شاعر کا سارا وجود سمٹ کر انتظار کے نقطے پر مرکوز ہے۔ خفیف سی خفیف آہٹ پر وہ چونک اٹھتا ہے۔ اسے اپنے محبوب کے قدموں کی آہٹ کا دھوکا ہوتا ہے۔ امید و بیم کی کیفیت ہے۔ امید کی لو ٹمٹما رہی ہے۔ پھر وہ بھڑک اٹھتی ہے اور پھر بجھ جاتی ہے۔

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

نظم کے پہلے مصرعے میں شاعر کا وجود ساری دنیا سے بے خبر ہے۔ وہ ہم کلامی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ دوسرے مصرعے میں اسے خیال آتا ہے کہ کوئی راہرو ہوگا جو کہیں اور چلا جائے گا۔ پھر انتظار کی شدت مایوسی میں بدلتی جاتی ہے۔ مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔ رات ڈھل چکی ہے۔ تاروں کا غبار بکھرنے لگا ہے۔ ایوانوں کے خوابیدہ چراغ لڑکھڑانے لگے ہیں۔ اسے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اب کوئی آنے والا نہیں ہے اس لیے وہ شمعیں گل کرنے، مے و مینا و ایاغ بڑھا دینے اور بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کی التجا کرتا ہے۔ کوئی نہیں کوئی نہیں کی تکرار انتہائی مایوسی کا اظہار بن جاتی ہے۔ یہ نظم کسی بھڑکتی ہوئی شمع کے بجھنے کی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ سارے حواس کو بیدار کرتی ہے۔ پہلے قوت شامہ بیدار ہوتی ہے۔ ہر آہٹ پر کان لگے ہوئے ہیں۔ پھر بصارت کی حس کو چھوتی ہے رات، تاروں کا غبار، چراغ..... پھر مذوقی حس کو جگاتی ہے، مے، مینا و ایاغ سے..... پھر بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کا عمل لمسی احساس پیدا کرتا ہے۔ اس طرح یہ ساری حسیں انتظار سے مایوسی کی طرف گامزن ہوتی ہیں۔

بعض نقادوں نے اسے جہان نو کا انتظار قرار دیا ہے۔ ن۔م۔ راشد نے تاروں کے بکھرے ہوئے غبار اور ایوانوں کے لڑکھڑاتے چراغ کا مطلب تہذیب کا بکھرتا شیرازہ لیا ہے۔ لیکن یہ مطالب دور از کار معلوم ہوتے ہیں۔

فیضؔ اپنے عہد کی حقیقت کا سامنا کرتے ہیں اور خوابوں کی شکست کے المیے کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ رومانی افسردگی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہلکی سی کسک، میٹھا میٹھا درد پُر لطف تڑپ اور محبوب کی چاہت میں شدت ہے۔ وہ چپکے چپکے آنسو بہاتے ہیں اور محبوب کے تغافل کے باوجود اسے چاہتے اور دعائیں دیتے ہیں:

راتوں کی خموشی میں
چھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے
ملبوس کو دھو لینا
جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بسا لینا
بھولی ہوئی یادوں کو
سینے سے لگا لینا

(انتہائے کار)

فیضؔ کی رومانی شاعری عشق کی مدہوشیوں اور جسم کی لذت کوشیوں کا بیان نہیں ہے۔ فیضؔ کے ہاں وصل کی سرشاری نہیں بلکہ جدائی کی خاموش

تڑپ ہے۔ یہ شاعری ایک ایسے شخص کے آنسوؤں و آہوں کی داستان ہے جسے اس بات کا احساس کھائے جا رہا ہے کہ زندگی چند روزہ ہے اور شباب اس سے بھی زیادہ چند روزہ ہے:

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب

(سرودِ شبانہ)

''سرودِ شبانہ''۔ ''تہہ نجوم''۔ ''یاس'' اور ''ایک منظر'' فیضؔ کی فن کاری اور مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان نظموں میں ایک پراسرار خاموشی اور معنی خیز سرگوشی ہے۔ پرسکون اور خواب آور مناظر شاعر کی روح کی طرح بوجھل اور نڈھال ہیں۔ لیکن ان مناظر کی افسردگی اور اضمحلال میں سرگوشیاں سنائی پڑتی ہیں۔ ان نظموں میں شاہراہوں کا تجسس ہے اور یہی نظمیں اس عبوری دور کی نشانی ہیں جہاں شاعر 'شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بنتا ہے۔ ان نظموں کا حسن و سکون آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ''سرودِ شبانہ'' میں شاعر نہ صرف عالم خود فراموشی میں ہے بلکہ اس کے وجود کا ذرہ ذرہ اپنے گرد و پیش کے منظر سے ہم آہنگ ہے۔

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
ساز دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمار کیف آگیں
آرزو ' خواب ' تیرا روئے حسیں

نظم ''انجام'' میں:

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں

پھر اوٹ لے کیدامن ابر بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم

(مرگِ سوزِ محبت)

ان نظموں میں منظر نگاری کے باوجود جس اختصار سے کام لیا گیا ہے وہ فنی اعتبار سے بے حد بلند ہے۔ 'مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو' 'تہہ نجوم' استفہامیہ اور تین منظر بھی جذبات کی مصوری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ''مرگ سوزِ محبت'' میں ایک کشمکش کے بعد وہ اعلان کرتے ہیں کہ:

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

''میرے ندیم'' استفہامیہ نظم ہے۔ وہ سوالیہ نشان قائم کرتے جاتے ہیں۔ شاعر حیرت زدہ ہے کہ وہ احساسات' وہ آرزوئیں کیا ہوئیں جن سے شعر کی دنیا آباد تھی۔ جن سے فکر و عمل رنگین تھی جس کے نور سے مہ و انجم شاداب تھے۔ جن سے جنونِ عشق کی ہمت جواں تھی۔ 'میرے ندیم' تجسس پر ختم ہوتی ہے۔ وہ اگلی محبتوں کے مزار پر چراغاں کر کے دبے پاؤں نکل جاتے ہیں:

چلو کہ چل کے چراغاں کردیں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار

فیض کی شاعری ایک ایسی فضا میں پہنچاتی ہے جس میں ہندوستان کے نوجوانوں کی تنہائی' بے یقینی جانبازی' بے جہتی سبھی کچھ تھا۔ یہ بڑی غم گسار فضا تھی۔ 'میرے ندیم' ہی وہ نظم ہے جہاں فیض شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بن جاتے ہیں۔ اب تک ان کی نگاہوں نے بقول۔ن۔م راشد:

''صرف حریری گلابی ملبوسوں میں لپٹی ہوئی خواب سے چور اور لذت سے سرشار تصویریں ہی دیکھی تھیں لیکن اب وہ ان مناظر کی طرف بڑھتا ہے جو تلخ ہیں جن میں ملبوس کی سرسراہٹ اور خواب کی ضیا پاشیاں نہیں بلکہ زندگی کی تڑپ اور پکار ہے۔''

بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کے بعد نئے دروازے دوسری شاہراہ پر کھلتے ہیں۔ وہ شاہراہیں جہاں رنگین وحریری ملبوسات ہیں' نہ کیف شراب نہ خمارِ خواب سے لبریز آنکھیں نہ رخساروں کے عشرت آلود غازے نہ سرخ ہونٹوں پہ تبسم کی ضیا' نہ مرمریں ہاتھوں کی لرزشیں نہ مخملی بانہیں اور جھلکتے ہوئے آنچل ہیں۔ یہ شاہراہ بدنما اور ٹھوس ہے۔ یہاں خاک وخون میں لتھڑے ہوئے اور نہائے ہوئے جسم' بازاروں میں مزدوروں کا بکتا ہوا گوشت' بھوک اگانے والے کھیت' ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹتے ہوئے عقاب' آرزؤں کی مقتل گاہیں' اجنبی ہاتھوں کا بے نام ستم' دلوں کی بے سود تڑپ اور جسموں کی مایوس پکار ہے۔

اس نئے دور کی پہلی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' ہے۔ شاعر اپنی ناسمجھی کا اعتراف کرتا ہے کہ اس نے محبوب کے وجود کو' محبوب کی صورت کو اور اس کی آنکھوں کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ اپنے محبوب کا حصول ہی اس کی منزل تھی لیکن اسے احساس ہو چلا ہے کہ:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اب وہ زندگی کی بدنما حقیقتوں سے آنکھیں نہیں چرا سکتا۔

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

.....

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجے

شاعر اب اطلس وکمخواب سے خون' پیپ' امراض اور ناسوروں کی دنیا میں آتا ہے۔ نظم ''کیا کیجے'' شاعر کی مجبوری کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ ناگزیر ہے۔ وہ حسن کا قدرداں ہے۔ وہ دنیا کی تلخ حقیقتوں سے گھبرا کر بند کواڑوں پر دستک دیتا ہے۔ وہ موت وزیست کی صف آرائی' شہر کی فراواں مخلوق کے باوجود کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں اور جسم کے دل آویز خطوط بھی نہیں بھولتا۔ وہ شام کی سلگتی ہوئی اداسی میں چشمۂ مہتاب سے دھلی ہوئی رات کا حسن فراموش نہیں کرتا۔ وہ سوچتا ہے:

آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

.....

جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

پھر وہ عالم خیال سے افکار کی دنیا میں آتا ہے اور صدیوں سے آدم و حوا پہ جو گزر رہی ہے اسے سوچ کر تڑپ اٹھتا ہے:

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جو بن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

پھر وہ گھبرا کر حسن و عشق کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتا ہے:

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے دل آویز خطوط!
آپ ہی کہیے، کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

.....

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

(موضوعِ سخن)

''چند روز اور مری جاں فقط چند روز'' ان کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ اس نظم میں انھیں ظلم و ستم کا شعور ہے جو ہندوستان کی سیاسی تحریکوں پر ڈھایا گیا۔ انھیں یقین ہے کہ ظلم کی یہ زنجیر ٹوٹ کر بکھر جائے گی:

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

بے شمار زخموں اور ناکامیوں کے باوجود فیض کو ایک نئی صبح کی آمد کا پورا یقین ہے۔ ''اے دل بے تاب ٹھہر'' میں ان کی امیدیں قوی ہو جاتی ہیں۔

یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے کو ہے اے دل بے تاب ٹھہر
جلد یہ سطوت اسباب بھی اٹھ جائے گی
یہ گراں بار مئی آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

نظم ''سوچ'' میں وہ کہتے ہیں

چھوڑو میری رام کہانی میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

وہ غم جاناں سے غم دوراں کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔

میرا دل غمگیں ہے تو کیا غمگیں یہ دنیا ہے ساری

فیض سکھ کے سپنے دیکھنے سے پہلے سب کے غم اپنانا چاہتے ہیں۔ان کے یہاں سرمایہ داری کے خلاف جذبہ بیدار ہوتا ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ سرمایہ داروں کے سکھ سارے انسانوں میں تقسیم ہو جائیں۔لیکن انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔اس کے لیے لمبی جنگ کرنی پڑے گی۔قربانیاں دینی پڑیں گی۔

بے فکرے دھن دولت والے یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں ؟
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں
ہم نے مانا جنگ کڑی ہے سر پھوٹیں گے ' خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے ہم نہ رہیں ' غم بھی رہے گا

یہ فیض کی شاعری کی نئی آواز ہے جو نئی سمت کا پتہ دیتی ہے۔لیکن یہ آواز نہ تو کرخت ہے اور نہ ہی اس میں گھن گرج ہے۔ فیض نے اپنے دل میں مچلتے ہوئے انقلابی نعروں کو شگفتگی اور نرمی عطا کی۔ یہ نرمی اور گداز اس لیے پیدا ہوا کہ غم محبت نے ان کی فکر کو غم حیات سے روشناس کروایا۔انفرادی محبت کی حدیں اجتماعی درد سے جا ملتی ہیں۔فیض نے رقیب کو ایک نئے معنی دیے۔وہ رقیب میں درد مشترک تلاش کرتے ہیں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرماں کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے

نظم ''کتے'' میں وہ ہندوستانیوں کو ذلت کا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں جو انگریزوں کی غلامی کی زنجیریں توڑنے سے قاصر تھے اور انتہائی لاچاری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔اگر عوام متحد ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو مضبوط سے مضبوط حکومت کی بنیادیں ہلا سکتی ہیں۔فیض نے راندہ درگاہ کتے کا لفظ استعمال کیا ہے۔کتے مظلوم مخلوق کی علامت ہیں۔

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساس ذلت دلادے
کوئی ان کی سوئی ہوم دم ہلادے

''کتے'' کے علاوہ ''بول'' بھی ان نظموں میں سے ہے جن میں رمز و کنایہ کے پردے میں فیض نے عزت نفس جگانے کی کوشش کی ہے:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول ' زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے

دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

لیکن مسلسل جدوجہد کے بعد آزادی آئی تو شاعر نے دیکھا

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

یہ آزادی فیض کی منزل نہیں تھی

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

(صبح آزادی، اگست 47ء)

فیض جانتے ہیں کہ حق و باطل کی اس جنگ میں سر پھوٹیں گے، خون بہے گا۔ وہ خاک نشینوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

(ترانہ)

فیض راولپنڈی سازش کیس کے تحت 9 مارچ 1951ء کو گرفتار ہوئے اور اپریل 1955ء تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ 'دست صبا' اور 'زنداں نامہ' ان ہی دنوں کی یادگار ہیں۔ ان دونوں مجموعوں میں فکر کی گہرائی اور فن کا کمال ہے۔ جیل کے اندر کی دنیا، تنہائی، باہر کی دنیا کا تصور ایک نیا شعور پیدا کرتا ہے۔ فیض ابتدا میں سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں تھے اور تین مہینے قید تنہائی میں کاٹے۔ کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، رسائل، اخبار، خطوط کسی چیز کی اجازت نہیں تھی۔ بڑی اذیت کا دور تھا۔ لیکن فیض کے یہاں کوئی تلخی نہیں آئی۔ انھوں نے کہا:

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

.....

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم

(طوق دار کا موسم)

قید کے زمانے میں فیضؔ نے بہترین شاعری کی۔ وطن کی پکار، غریبوں کی آہیں، مظلوموں کی تڑپ، آنے والے دور کی آہٹیں سب کچھ انھوں نے محسوس کیا۔ حب الوطنی اور سوز عشق ایک ہو گئے۔ وطن کا تصور، محبوب کے پیکر میں ڈھل گیا:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

وہ کہتے ہیں

بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

(نثار میں تیری گلیوں کے.....)

اور نظم ''یاد'' میں بھی وطن اور محبوب ایک ہو جاتے ہیں

اس قدر پیار سے اے جان جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

فیضؔ کا تعلق مزدور تحریک سے تھا۔ جیل میں رہ کر بھی فیضؔ ایسا محسوس کرتے تھے جیسے وہ جیل کے باہر محنت کشوں کے ساتھ قدم ملا کر چل رہے ہوں۔ وہ مفلس، نادار، مفلوک الحال، غریب اور محنت کش عوام سے مخاطب ہو کر نظم ''شیشوں کا مسیحا'' کوئی نہیں''۔ لکھتے ہیں:

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا سو جھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشیوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یہ شیشے دراصل عزت و ناموس اور خواب ہیں۔ فیضؔ کہتے ہیں ان شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں ہے۔ ان ٹکڑوں کو جوڑنے والا کوئی نہیں۔ فیضؔ دونوں طبقات کا تقابل کرتے ہیں ایک وہ جن کے پاس سب کچھ ہے اور جو اپنی دولت پر پردے لٹکائے بیٹھے ہیں۔ دوسرے وہ جوان پردوں کو نوچ گراتے ہیں۔ یہ کشمکش جاری ہے۔ دونوں میں گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ فیضؔ کہتے ہیں کہ اپنا حق چھین کر حاصل کرنا چاہیے۔ ساری نظم رمزیہ پیرائے میں ہے اس میں کوئی سیاسی نعرہ نہیں ہے۔

مارچ 1954ء میں فیضؔ کو تین ہفتوں کے لیے لاہور جیل لایا گیا۔ فیضؔ کو لاہور سے بے حد پیار تھا۔ انھوں نے نظم ''اے روشنیوں کے شہر'' لکھی۔ فیضؔ کی شاعری جذبے، فکر، داخلیت و خارجیت کے امتزاج اور توازن کی حیرت انگیز مثال ہے۔ فیضؔ کا مسلک محبت ہے۔ وطن سے محبت، بنی نوع انسان سے محبت! اس کے علاوہ درد بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ فیضؔ نے اپنی مشہور نظم ''ملاقات'' منٹگمری جیل میں کہی۔ اس نظم میں پہلے شاعر رات کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ رات کو شجر کی علامت بناتا ہے تاکہ زندگی قابل برداشت ہو جائے۔ پھر ملاقات ایک قوت بن جاتی ہے جو درد کے رشتوں کو استوار کرتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ الم نصیبوں، جگر فگاروں کی صبح افلاک پر نہیں بلکہ زمین پر ہے۔

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں

اس نظم میں فیضؔ نے خوبصورت استعارے استعمال کیے ہیں۔ یہ نظم معریٰ (Bland Verse) ہے۔ منٹگمری جیل میں انھوں نے ''دریچہ'' اور ''درد آئے گا دبے پاؤں'' جیسی نظمیں لکھیں۔ جیل میں ہی جب ایتھل اور جولیس روزن برگ کی شہادت کی خبر ملی تو فیضؔ نے اپنی مشہور نظم ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' کہی۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''فیضؔ دیکھ رہے تھے کہ ظلم و استبداد کے خلاف یہ حشر خیز تحریکیں صرف ان کے وطن میں نہیں ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں سر اٹھا رہی ہیں۔ انھوں نے ساری دنیا کے حریت پسندوں باغیوں کی جدوجہد سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا۔ اپنی نظم ''آ جاؤ افریقا'' میں انھوں نے کینیا اور دوسرے آفریقی ملکوں کے حریت پسند عوام کی آواز سے آواز ملائی ہے۔ ایران کے قید خانوں میں وطن پرست نوجوان شاہ کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ (شبستاں، فیض نمبر ص 67)

''سرِ وادیٔ سینا''، ''فلسطینی بچے کے لیے لوری''، ''فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے'' جیسی نظمیں لکھیں۔ فلسطین فیضؔ کا وطن ثانی تھا۔ وہ اس کا ذکر بڑے دکھ اور پیار سے کرتے ہیں:

میں جہاں پر بھی گیا ارض وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے

.....

جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارض فلسطیں کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

''ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کے لیے''میں انھیں جیت کا یقین ہے:

ہم جیتیں گے
حقا کہ ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

فیضؔ اقتصادی بربادی یا معاشرتی الجھاد کو اپنا موضوع نہیں بناتے۔ جس چیز کا احساس فیضؔ کو سب سے زیادہ ہے وہ سیاسی غلامی اور ظلم واستبداد کا آہنی پنجہ ہے۔ فیضؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ ظلم کو ظلم اور ستم کو ستم کہنے کا سلیقہ سکھایا' انکار کی جرات عطا کی' مشاہدہ حق کی گفتگو میں حسن کی لطافتوں کا رنگ بھر کے گفتگو کو زیادہ بامعنی' دلکش اور پراثر بنادیا۔ ان کے کئی اشعار ضرب المثل بن گئے۔ فیضؔ نے احتجاج کے ساتھ دعا بھی کی۔ یہ دعا بھی ان کے خیالات کی ترجمانی کرتی ہے:

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوز محبت کے سوا
کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں

(دعا)

فیضؔ سوز ومحبت کے شاعر ہیں۔ ان کا یہ سوز درد کے رشتے میں ڈھل کر آفاقی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ فیضؔ کو یقین ہے کہ آخر کار خلقِ خدا کا راج ہوگا۔ نظم'' **ویبقیٰ وجه ربك** ''میں وہ کہتے ہیں۔

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے

وہ کہتے ہیں کہ وہ دن آئے گا جب ظلم وستم کے کوہ گراں روئی کی طرح اڑ جائیں گے اور محکوموں کے پاوں تلے دھرتی دھڑ کے گی' اہل حکم کے سر کے اوپر بجلی کڑکے گی اور ارض خدا کے کعبے سے سب بت اٹھوائے جائیں گے اور ہم اہل صفا' مردودِ حرم مسند پہ بٹھائے جائیں گے۔ وہ آگ چل کر کہتے ہیں:

سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جوغائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اٹھے گا اناالحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اور راج کرے گی خلق خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

فیضؔ کا اپنی شاعری کے بارے میں یہ کہنا پوری طرح سچ ثابت ہوتا ہے کہ:

ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے

26.4.1 اسلوب سخن

فیضؔ کی شاعری میں عاشق و مجاہد کی کشمکش ہے۔ ان کی شاعری روایت و اجتہاد کی بہترین مثال ہے۔ فیضؔ نے پرانی علامتوں کو نئی معنویت دی ہے۔ صیاد، اہل قفس، گلچیں، قاتل، مقتول، اہل ستم، دار و رسن، شام و سحر اور وصل و ہجر کا استعمال انھوں نے خاص سماجی تناظر میں کیا اور نئے مفاہیم کے ترجمان بن گئے۔ فیضؔ نے جو پیکر تراشے ہیں وہ ان کے منفرد طرز ادا کی غمازی کرتے ہیں۔ زبان کے نئے سانچے انھوں نے اردو شاعری کو دیے ہیں۔ ''بے صبر خواب گاہیں''۔ ''اجنبی بہاریں''۔ ''ترسی ہوئی شب''۔ ''بیزار قدم''۔ ''ہونٹوں کے سراب''۔ ''ناکام نگاہیں''۔ ''خوابیدہ راحتیں''۔ ''منتظر راہیں''۔ ''جھلسی ہوئی ویرانی''۔ ''بے خواب کواڑ''۔ ''درد کے فاصلے'' وغیرہ۔ فیضؔ کے پاس بے پناہ تراکیب ہیں۔ فیضؔ کے یہاں بے شمار خوبصورت تشبیہات ملتی ہیں چند مثالیں دیکھیے:

سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

.....

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے

.....

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

اسلوب کے اعتبار سے فیضؔ کی شاعری قدیم و جدید میلانات کا دلکش آمیزہ ہے۔ قدیم شاعری سے جہاں انھوں نے گھلاوٹ، جذباتی کسک، انسان دوستی، نغمگی اور فنی رچاؤ لیے وہیں عالمی ادب کے جدید رجحانات اور انگریزی رومانی شاعری کے اثرات بھی قبول کیے۔ فیض کی شاعری فلسفے کے بوجھ تلے دبی ہوئی نہیں ہے لیکن اس پر ایک مخصوص نظریے کی مہر لگی ہے۔ ان کی موضوعاتی شاعری میں تلخی حیات اور تلخی حالات کا ذکر ہے لیکن جھنجھلاہٹ اور زندگی سے بے زاری کا احساس نہیں ملتا۔ فیضؔ کے یہاں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت اور اعتدال پسندی ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے ایک بحرانی دور میں انفرادیت برقرار رکھی۔ فیضؔ کی شاعری میں ان کے عہد کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس میں ان کی ذات اور اس عہد کا شعور موجود ہیں۔ عصری حسیت اور عرفان ذات دونوں نے فیضؔ کی شاعری کو تقویت بخشی ہے۔ اسی میں ان کی انفرادیت ہے اور فیضؔ کا فن پوری نسل کو متاثر کرتا ہے۔ فیضؔ کے یہاں خارجی زندگی کے تجربے شخصی واردات بن کر اجاگر ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بشارت سحر اور نوید بہار کا تصور ملتا ہے۔ فیضؔ انسانیت کے درخشاں مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ فیض کہتے ہیں:

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فیض کی نظموں کے موضوعات کیا کیا ہیں؟
2. فیض نے زنداں میں کون کون سی نظمیں لکھیں؟
3. فیض کے اسلوب کی خوبیاں بیان کیجیے۔

26.5 نظم: مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت ‘مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا کہ جو تو ہے‘ تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے‘ تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے ؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے ؟
تو جو مل جائے ‘ تو تقدیر نگوں ہوجائے
یوں نہ تھا‘ میں نے فقط چاہا تھا‘ یوں ہوجائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بہ جا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے‘ خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر‘ کیا کیجیے ؟
اب بھی دلکش ہے ترا حسن ‘ مگر کیا کیجیے ؟
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

26.5.1 مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ کا تجزیہ

یہ نظم فیضؔ کے پہلے شعری مجموعے ''نقش فریادی'' سے لی گئی ہے۔ یہ نظم فیضؔ کی شاعری میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مرکزی خیال اردو شاعری میں ایک اہم رجحان بن گیا۔ فیضؔ آخر تک عشق اور انقلاب کے نقیب رہے۔ ایک عاشق اور مجاہد کی کشمکش میں مبتلا رہے لیکن اس نظم سے وہ رومانی فضا کے اثر سے نکل آئے۔ یہیں سے ان کا سفر شدید داخلیت سے خارجیت کی جانب گامزن ہوا۔ یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ نئے شعرا غم دوراں کو غم جاناں کی شدت میں کمی کا جواز ٹھہرانے لگے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' سے فیض کے یہاں دو قسم کی تبدیلیاں ہوتی ہیں پہلی یہ کہ رومان اور خالص جمالیاتی اقدار کے علاوہ زندگی کی دوسری قدریں بھی ان کے یہاں ابھرنے لگتی ہیں۔ دوسری یہ کہ

حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر کی وجہ سے رخِ محبوب کے سیال تصور کی مثالیت ختم ہونے لگتی ہیں۔

(دھنک رنگ لمحوں کا شاعر۔فن اور شخصیت۔فیض نمبر ص 92)

یہ نظم تین بند اور بیس مصرعوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک سادہ بیانیہ اور پابند نظم ہے۔ نظم مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ سے شروع ہوتی ہے اور اسی مصرعے پر ختم ہوتی ہے۔ تین بند چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ پھر دو مصرعے ہیں آخری اور چوتھا بند چار مصرعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں شاعر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ اپنے محبوب ہی کو سمجھا تھا۔ محبوب کے وجود سے اس کی حیات درخشاں تھی۔ محبوب کا غم ہی سب کچھ تھا' اس غم میں اس نے دنیا کے سارے غم بھلا دیے تھے۔ اس کی صورت سے سارے عالم میں بہار تھی اور پھر وہ اپنے محبوب کی آنکھوں کو دنیا کی سب سے قیمتی شئے سمجھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سوا دنیا میں کچھ بھی نہیں رکھا ہے۔ دوسرے بند میں وہ پہلے بند کے تسلسل میں کہتا ہے کہ اپنے محبوب کا حصول اس کے لیے تقدیر کا سب سے بڑا عطیہ تھا۔ جیسے اس نے تقدیر کو جھکا دیا اس پر فتح پالی ہو۔ ایسا ہوا تو نہیں لیکن شاعر کی شدید خواہش تھی کہ ایسا ہو جائے۔ اس کے بعد دو مصرعوں میں شاعر گریز کرتا ہے۔ یہ نظم کا انتہائی اہم موڑ ہے۔ یہاں سے شاعر اپنی محبت کی دنیا سے نکل آتا ہے۔ اس کی نظر محبوب کے وجود سے ہٹ کر دوسری طرف منعطف ہوتی ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ محبت کے غم کے علاوہ دنیا میں بے پناہ غم بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وصل کی راحت ہی سب کچھ نہیں ہے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اگلے بند میں نظم کا موڈ بالکل بدل جاتا ہے۔ گرہ کھلنے لگتی ہے کہ شاعر کے خیالات میں یہ تبدیلی کیوں آئی۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ صدیوں سے انسان پر ظلم ہو رہا ہے۔ ایک تاریک بہیمانہ طلسم ہے جس میں انسان گرفتار ہے۔ انسانی جسم کو ریشم' اطلس و کمخواب میں لپیٹ کر کوچہ و بازار میں جابجا بیچا جا رہا ہے۔ فیض کا اشارہ جسم فروشی کی طرف ہے۔ جو صدیوں سے جاری ہے۔ سماج میں بھوک ہے بیماری ہے۔ لاکھوں لوگوں کے پاس نہ روٹی ہے اور نہ دوا امراض ہیں..... ناسوروں سے پیپ بہہ رہی ہے۔

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''اگر یہ اشعار جوش کے قلم سے ٹپکتے تو دھچکا نہ لگتا کیوں کہ ان کی بغاوتوں کے ہم عادی رہے ہیں لیکن فیض کے یہاں غازہ و رخسار اور ضیائے تبسم کے ساتھ خون اور پیپ کا تصور! بہت سے شاعر اور نقاد چیخ اٹھے۔ وہ تو خود ہی فیض نے جب نظم کے خاتمہ پر اس کا ازالہ اس طرح کیا ہے کہ:

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے

تو ایک گونہ تسلی ملی۔ لیکن یہیں سے فیض کی یک رنگ شاعری میں دوسرے رنگ کا تار ملتا ہے۔ اس نئے شعور نے فیض کا تصورِ محبت ہی بدل دیا۔

(فن اور شخصیت: فیض نمبر ص 93-92)

حمید نسیم اس بند کو سیاسی نعرے سے تعبیر کرتے ہیں لیکن وہ بھی اس بات سے متفق ہیں کہ اگلا مصرعہ اس کا ازالہ کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگلا بند اساسی طور پر نعرہ ہے۔ مگر شاعر نے اسے نعرہ کی سطح سے اٹھا کر جمال کا پیرہن عطا کر دیا ہے۔ پھر دوسرے بند کے آخری مصرعے دہرا کر نظم Climax پر پہنچ جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر دوسرے بند کے اختتام پر نظم ختم کر دی جاتی تو اس تکرار سے بچ جاتی اور تاثر شاید ان کہی کے باعث شدید تر ہوتا۔

(پانچ جدید شاعر: ص 32-31)

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے

یہ مصرعے شاعر کی کشمکش کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن تین مصرعوں کو دہرا کر شاعر اس بات پر مہر ثابت کرتا ہے کہ وہ غم جاناں سے غم دوراں کی طرف آ گیا ہے۔ اور اس کے پاس غم دوراں کی زیادہ اہمیت ہے۔ وہ اس بات کو سمجھنے لگا کہ انفرادی دکھ اور سکھ اور راحتوں سے ہٹ کر کچھ اور دکھ ہیں جو کہیں زیادہ اہم ہیں اور فوری توجہ چاہتے ہیں۔ کیا کیجیے میں غیر ارادی پن جھلکتا ہے۔ شاعر انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ فیض کی یہ الجھن اور کشمکش حقیقی تھی اس لیے اس نظم میں تاثر کی شدت پائی جاتی ہے۔ پہلا مصرعہ ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پھر وہ نظم میں کھوتا چلا جاتا ہے۔ اس نظم میں فیض ''پیپ اور گلتے ہوئے ناسوروں'' کا ذکر کرتے ہیں جس سے جمالیاتی احساس کو ٹھیس پہنچتی ہے بعد میں فیض نے ایسی لفظیات کو ترک کر دیا۔ فیض کی شاعری میں رومان اور انقلاب کے درمیان کشمکش اور ذہنی الجھن کا سلسلہ اسی نظم سے شروع ہوتا ہے۔ یہ نظم خیال، جذبے اور احساس کا ایسا دائرہ بناتی ہے جس میں قاری محصور ہو جاتا ہے۔ اس کے کئی مصرعے زبان زد خاص و عام ہو گئے۔ جیسے

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

.....

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیض کی یہ ایک اہم نظم ہے جو ان کی شاعری کے مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ ..... بند ..... مصرعوں پر مشتمل ہے۔
2. یہ نظم جس مصرعے سے شروع ہوتی ..... مصرعے پر ختم ہوتی ہے۔
3. اس نظم کا زبان زد خاص و عام شعر کون سا ہے؟

26.6 نثار میں تری گلیوں کے .....

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں
یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ظلم ہے سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے' نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے
گر آج تجھ سے جدا ہیں' تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا ؟
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

26.6.1 شار میں تری گلیوں کے.....کا تجزیہ

یہ نظم فیض کے دوسرے شعری مجموعے ''دست صبا'' سے لی گئی ہے۔ فیض نے یہ نظم قید کے دوران لکھی۔ نظم سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر قید ہے اور اپنے وطن کی گلیوں کے تصور میں غرق ہے۔ یہ نظم چار مصرعوں کے پانچ بند پر مشتمل ہے۔ ہر بند کے بعد دو مصرعے ہیں۔ پہلے بند میں شاعر اس ڈکٹیٹر شپ کے بارے میں اظہار کرتا ہے جہاں سخت پابندی ہے۔ کسی کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ جہاں اختلافِ رائے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہر نقل وحرکت پر پابندی ہے۔ اپنے وطن میں آزادانہ گھومنے پھرنے کو بھی مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اہلِ دل اور اہلِ نظر پر سخت پابندی ہے۔ پتھر مقید ہیں اور کتے آزاد ہیں۔ پتھر سے مراد وہ جو حق کی بات کرتے ہیں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ دم ہلانے والے' بات بے بات غرانے والے آزاد ہیں۔ جو وطن کی بھلائی چاہتے ہیں ان پر ظلم کیا جارہا ہے۔ اہل ہوس ہی مدعی بھی ہیں اور منصف بھی۔ دعوی کرنے والے بھی اہل ہوس ہیں اور انصاف کرنے والے بھی وہی ہیں۔ ایسے میں اپنی بات پہنچانا اور انصاف کی توقع رکھنا فضول ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ فیض کی نظم کا یہ بند ایسا ہے جہاں وطن کی محبت اور محبوب کا تصور ایک ہوجاتے ہیں۔ شاعر چار دیواری میں قید ہے۔ صرف زنداں میں ایک روزن ہے۔ جب روشن داں اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اب رات ہوچکی ہے اور وطن کی مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی اور جب روزن سے آتی شعاعوں سے زنجیریں چمکنے لگتی ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ صبح ہوچکی ہے۔ اور وطن کے چہرے پر سحر نے اپنا نور بکھیر دیا ہوگا۔ یہ وطن بھی ہوسکتا ہے اور محبوب بھی۔ یہاں وطن اور محبوب کا تصور گھل مل جاتے ہیں۔ شاعر شام وسحر اسی تصور میں گزار رہا ہے۔ اسی تصور میں وہ درودیوار کے سائے میں زندہ ہے۔ اسی امید نے شاعر کو زندہ رکھا ہے۔ اگلے بند میں شاعر کہتا ہے۔ ظالم اور مظلوم کا یہ ٹکراؤ نیا نہیں ہے۔ ظالم سے خلق ہی الجھتی ہے۔ عوام ہی انقلاب کے نقیب ہوتے ہیں۔ صدیوں سے یہی ریت ہے۔ صداقت اور حق کی بات کرنے والوں پر ظلم کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ انھیں مصلوب کردیا جاتا ہے۔ ان کی راہوں میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں۔ طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ آگ میں پھول کھلانے کی تلمیح ابراہیمؑ سے وابستہ ہے۔ ابراہیمؑ نے حق کے لیے آتش نمرود میں

چھلانگ لگائی تھی اور آگ گلزار ہوگئی تھی۔ حق و باطل کی یہ کشمکش صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن شاعر کو یقین ہے کہ آخر میں جیت حق و صداقت کی ہوتی ہے۔ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے۔ اہل حق کا یہی اطمینان انھیں ہر ظلم برداشت کرنے کی طاقت بخشتا ہے۔ فیضؔ کہتے ہیں یہی بات انھیں حوصلہ عطا کرتی ہے اور وہ خدا سے گلہ نہیں کرتے۔ اور یہ جو فراق ہے۔ وطن سے جو دوری ہے' قید کی جو زندگی ہے اس کی وجہ سے دل بُرا نہیں کرتے کیوں کہ کامیابی یقینی

فیضؔ کو اپنی کامیابی پر کامل یقین ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ رات بھر کی جدائی ہے اس کے بعد صبح تو طلوع ہوگی۔ رات' ظلمت کا استعارہ ہے۔ وہ کہتے ہیں ظلم ہمیشہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس لیے یہ جو وطن سے جدائی ہے وہ عارضی ہے۔ آنے والے کل وہ وطن میں ہوں گے۔ یعنی پھر سے ان کی مصروفیات شروع ہو جائیں گی..... وہ جانتے ہیں کہ دشمن کا آج عروج ہے۔ لیکن یہ عروج ہمیشہ نہیں رہے گا۔ بس یہ چار دن کی جدائی ہے۔ اور خدائی بھی چار روزہ ہے۔ اس لیے وہ وطن سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں۔ اور ایک امید افزا صبح کے تصور میں دن رات گزارتے ہیں۔

فیضؔ کا ایقان صبح نو پر ہے۔ ایک انقلاب کی امید ہے۔ یہی امید انکی شاعری کو ایک نئی قوت بخشتی ہے اور یقین کو بلند سطح پر پہنچاتی ہے..... اس نظم میں بیانیہ اور علامتیں ساتھ ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ فیضؔ کی یہ نظم بیانیہ ہوتے ہوئے بھی راست اظہار کی حامل نہیں ہے۔ جسم چرانا' سنگ و خشت' سگ' اہل جنون' اہل ہوس' مدعی' منصف' آگ میں پھول' رقیب وغیرہ خوب صورت اشارہ بن گئے ہیں۔ وطن کی محبت اور تڑپ کا اندازہ اس نظم سے ہوتا ہے۔

فیضؔ کی شاعری میں گھن گرج اور نعرہ بازی نہیں ملتی۔ وہ ذہنی توازن نہیں کھوتے۔ قید و بند سے گھبراتے نہیں۔ انھیں اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ وہ قید میں ہیں اور اس طرح تحریکوں میں حصہ نہیں لے سکتے ہیں لیکن یہ پختہ یقین بھی ہے کہ صورت حال بدلے گی اور ظلم کا دور ختم ہوگا۔ لہجے کا دھیما پن اور یقین کی پختگی ان کی شاعری کو منفرد بناتی ہے۔ فیضؔ کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ یہ نظم بھی اپنے عصر کی عکاسی کرتی ہے۔ ساتھ ہی فیضؔ کے جو دل میں گزرتی ہے وہ بھی رقم کرتے جاتے ہیں۔ فیضؔ کی آپ بیتی' جگ بیتی بن جاتی ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں درد کی ایک زیریں لہر بہتی ہے۔ اس نظم میں بھی اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر سلامت اللہ خاں لکھتے ہیں:

> ''فیضؔ کی شاعری میں ایسا حزن و ملال' ایسا درد و الم' ایسی غم انگیزی ہے جس میں ہار ڈی یا فانی کی قنوطیت کی خنکی نہیں بلکہ جو حسین ہے' جو پر اسرار ہے۔ جو خواب آور ہے جو جمالیاتی لذت سے چور ہے۔ فیضؔ کی آنکھیں فکر مند بھی ہیں اور دردمند بھی..... لیکن جس چیز کا ہمیں شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کی آنکھیں منتظر بھی ہیں آنے والے محبوب کی..... کسی رنگین آنچل کی۔ گھنے درختوں پر تھکی ہوئی' سوئی ہوئی چاندنی کی۔ سرگوشیوں کی۔ ایک الجھے ہوئے موہوم سے درماں کی اور اس عہد نو کی جس پر انھیں یقین ہے۔''

(فیض احمد فیض۔ تنقیدی جائزہ ص 147)

فیضؔ کی اس نظم کے اشعار بھی زبان زد خاص و عام ہوئے۔ خاص طور پر یہ شعر:

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں' کس سے منصفی چاہیں

فیضؔ کی یہ نظم ان کی حب الوطنی کی روشن مثال ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اس نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

الف) وطن کی جدائی عارضی ہے آنے والا کل آزادی کی بشارت لائے گا۔

ب) وطن سے جدائی دائمی ہے اور قید خانہ ہی شاعر کا مقدر ہے۔

ج) شاعر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔

2. سنگ و خشت مقید ہیں اور ..... آزاد (سگ' چور' شجر)

3. کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں۔ مصرعہ اولیٰ کیا ہے؟

الف) بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے

ب) چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

ج) بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی

26.7 نظم: شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انھیں ٹکڑوں میں کہیں
صد ناز سے اترا کرتی تھی
وہ ساغر دل ہے جس میں کبھی
صہبائے غم جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
جو مے تھی، بہادی مٹی میں
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
تم مست جوانی میں جن سے
ان شوخ بلوریں سپنوں کے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری، دفتر، بھوک اور غم
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
اُن سپنوں سے ٹکراتے رہے
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذروں میں کہیں
وہ جس سے تمھارے عجز پہ بھی
موتی ہے تمھاری عزت کا
شمشاد قدوں نے رشک کیا

اُس مال کی دُھن میں پھرتے تھے
ہے چور نگر، یاں مفلس کی
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
گر جان بچی، تو آن گئی

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں، تو فقط
سالم ہوں، تو قیمت پاتے ہیں
چبھتے ہیں، لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چُن چُن کر
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے؟
اک بخیہ اُدھیڑا، ایک سیا
یوں، عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کارگہہ ہستی میں جہاں   یہ ساغر ، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے   سب دامن پر ہوسکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے ، یاور ہے یہاں   جو آنکھ اٹھے ، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں   ہوں گھات میں ڈاکو ڈکھ ، مگر

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی   دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں   یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ جو ہیں اس دولت پر   پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ، ہر ساگر کو   نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں ، جو لڑ بھڑ کر   یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی   ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے   نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے پر   ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں   وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں   وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر، شیشے ، لعل و گہر   اسی بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو   اس رن سے بلاوے آتے ہیں

26.7.1 نظم: شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کا تجزیہ

فیض کی یہ نظم ان کے دوسرے شعری مجموعے "دست صبا" سے لی گئی ہے۔ یہ فیض کی طویل نظم ہے جو انیس بندوں اور 76 مصرعوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظم طبقاتی جنگ میں جو ہر جگہ لوٹنے والوں اور "لٹے ہوؤں" کے درمیان جاری ہے اس میں شرکت کی دعوت ہے۔

پہلے بند میں شاعر کہتا ہے کہ موتی ہو کہ شیشہ، جام یا دُر ایک بار ٹوٹنے کے بعد دوبارہ جڑ نہیں سکتے۔ ان کے ٹکڑے چن چن کر دامن میں چھپائے رکھنا بے کار ہے کیوں کہ کسی شیشے کے مسیحا کی توقع رکھنا فضول ہے۔ نظم آگے بڑھتی ہے تو ان شیشوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان شیشوں میں "ساغرِ دل"۔ "سپنے" اور "عزت" ہیں۔ ساغر دل جس میں غم جاناں کی پری بڑے ناز سے اترا کرتی تھی اسے دنیا والوں نے پھوڑ ڈالا۔ رنگین سپنے جو مست جوانی میں دیکھا کرتے تھے وہ ناداری، دفتر، بھوک اور غم سے ٹکرا کے چور چور ہو گئے کیوں کہ چوکھ پتھراؤ تھا۔ اس کے سامنے کانچ کے یہ ڈھانچے بے بس تھا۔ شاعر کہتا ہے شیشے کے ان ٹکڑوں میں عزت کے موتی بھی ہیں۔ یہاں شاعر غریب کی عزت کو اہمیت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس عزت کو پانے کی کوشش نام نہاد قد آور شخصیتیں، تاجر اور رہزن کرتے ہیں۔ وہ اسی دھن میں پھرتے ہیں تا کہ وہ اسے پامال کر سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غریب کی اگر جان محفوظ بھی رہی تو اس کی آن باقی نہیں رہتی۔ فیض یہ واضح کرتے ہیں کہ دولت مند افراد کس طرح غریبوں کا استحمال کرتے ہیں۔ ان کا دل، ان کے خواب اور ان کی عزت کے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور یہ ٹکڑے چبھتے ہیں لہو رلواتے ہیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر اگر سالم ہوں تو ان کی قیمت ہے۔ ٹکڑوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں اس لیے ٹکڑوں کو دامن میں چھپا کر کسی مسیحا کی آس لگائے رکھنا فضول ہے۔

نظم ایک نیا موڑ لیتی ہے۔فیض کہتے ہیں یادوں کے سہارے کب تک زندہ رہا جاسکتا ہے۔یادوں کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بخیہ ادھیڑا ایک سیا..... اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا اور نہ کچھ حاصل ہوسکتا ہے۔فیض کہتے ہیں دنیا میں ہر شئے کا بدل مل سکتا ہے۔ہر دامن پر ہوسکتا ہے۔یہاں دولت کی کمی نہیں ہے۔اس میں شک نہیں کہ یہاں ڈاکو بھی گھات میں بیٹھے ہیں لیکن یہاں ہاتھ بڑھا کر اپنا حصہ چھیننا پڑتا ہے۔بقول شاد عظیم آبادی:

یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یہاں صرف ہیرے اور موتی کی تلاش کی ضرورت ہے ورنہ پربت، ہیروں اور ساگر موتیوں سے خالی نہیں ہیں۔فیض کہتے ہیں کہ ایک طرف چور، ڈاکو، رشوت خور، اٹھائی گیرے اور وہ ہیں جن کے پاس مال و دولت عیش و آرام سب کچھ ہے۔دوسری طرف وہ ہیں جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ایک طرف وہ ہیں جنھوں نے دولت پر پردہ ڈال رکھے ہیں دوسری طرف وہ ہیں جوان پردوں کو نوچ گراتے ہیں۔ان دونوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑتا ہے۔یہ لڑائی بستی بستی نگر نگر ہورہی ہے۔جن کے پاس سب کچھ ہے وہ کالک پوتتے پھرتے ہیں ہر راہ میں اندھیرا کردیتے ہیں دوسری طرف جن کے پاس کچھ نہیں وہ انھیں راستوں پر جوت جگاتے ہیں وہ آگ لگاتے ہیں یہ آگ بجھاتے ہیں۔فیض کہتے ہیں اس لڑائی میں ساغر، شیشے، لعل و گہر بدجاتے ہیں۔اور آخری دو مصرعوں میں، وہ لوگ جو خالی ہاتھ ہیں ظلم و ستم کا شکار ہیں اس رن میں کود پڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔

نظیر صدیقی اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فیض نے ایسے لوگوں کو جو یاس و حسرت کی زندگی بسر کرنے پر قانع ہوگئے ہیں، ہستی کے اٹھائی گیروں سے لڑنے کی ترغیب جس انداز سے دی ہے یہ انھیں کا حصہ ہے۔اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سیاسی جدوجہد کی دعوت دینے کے باوجود سیاسی نعرہ زنی کو راہ نہیں دی گئی ہے۔ (عکس اور جہتیں۔ص 123)

فیض کی اس نظم میں بھی ایمائیت اور اشاریت موجود ہے۔چوتھے، چھٹے اور آٹھویں بند میں وہ سادہ بیانیہ سے کام لیتے ہیں۔کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ اس نظم میں صرف سات بند ہوتے تو نظم اچھی ہوسکتی تھی۔انھوں نے صرف ایسے بندوں کا انتخاب کیا ہے۔جن میں اشاریت ہے۔فیض نے رمز اور کنایے میں دولت مندوں اور ناداروں کے ٹکراؤ کو پیش کیا ہے۔نظم کی ایمائیت اور اشاریت جگہ جگہ مجروح ہوتی ہے۔فیض کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ دکھ اور مایوسی کے پیچھے ماحول کے دکھ درد کی کہانی ہوتی ہے۔فیض کی شاعری میں جہاں کرب کی گہرائی ہے وہیں ہمت اور عزم امید کی طرف لے جاتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. کون سے اشعار دہرائے گئے ہیں؟

الف) موتی ہو کہ شیشہ جام کے در — جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کیا اشکوں سے جڑ سکتا ہے — جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا

ب) تم ناحق ٹکڑے چن چن کر — دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں — کیا آس لگائے بیٹھے ہو

ج) سب ساغر شیشے لعل و گہر — اسی بازی میں بدجاتے ہیں
اٹھو! سب خالی ہاتھوں کو — اس رن سے بلاوے آتے ہیں

2. اس نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

الف) لوٹنے والوں اور لٹے ہوؤں کے درمیان جنگ
ب) شیشوں، موتی اور دُر کا کاروبار
ج) شیشے کی دکانوں سے پردے گرانا

3. اس نظم کا لہجہ کیسا ہے؟ الف) کرخت ب) نعرہ بازی کا ج) اعتدال کا

26.8 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے فیضؔ کی حیات' کارنامے اوران کی نظم نگاری کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

فیضؔ کا پورا نام فیض احمد خاں تھا۔ وہ 13 فروری 1911ء کو پیدا ہوئے۔ جائے پیدائش قصبہ قادر' ضلع سیال کوٹ ہے۔ اپنے والد کے زمانے میں انھوں نے بڑی خوش حال زندگی گزاری۔ فیضؔ نے انگریزی اور عربی میں ایم۔اے کیا۔ ان کا پورا تعلیمی کیریر فرسٹ کلاس ہے۔ فیضؔ درس وتدریس سے وابستہ رہے پھر فوج میں ملازمت اختیار کی۔ انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز' امروز ہفت روزہ لیل ونہار کے چیف ایڈیٹر رہے۔ قیام پاکستان کے تین برس بعد 1951ء میں راولپنڈی سازش کیس کے تحت گرفتار ہوئے۔ اپریل 1959ء میں رہائی ملی۔ فیضؔ کا انتقال 20 نومبر 1984ء کو ہوا۔ نقش فریادی' دست صبا' زنداں نامہ' دست تہہ سنگ' سرِ وادیٔ سینا' شام شہر یاراں' میرے دل میرے مسافر فیض کے شعری مجموعے اس کے علاوہ ان کے نثری مضامین' خطوط کے مجموعے اور سفرنامے بھی ہیں۔

فیض کی شاعری کی ابتدا 1928ء سے ہوئی۔ ان کی پہلی نظم ''میرے معصوم قاتل'' ہے۔ فیضؔ نے ابتدا میں رومانی شاعری کی۔ لیکن بہت جلد وہ حقیقت کی طرف راغب ہوئے۔ فیضؔ کی شاعری میں رومان وحقیقت کی دھوپ چھاؤں ابتدا سے انتہا تک ہے۔ وہ رومان اور حقیقت کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایک رہگذر پر' خدا وہ وقت نہ لائے''۔ ''سرودشبانہ''۔ ''مری جان اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو''۔ ''میرے ندیم'' ان کی رومانی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں تنہائی اور انتظار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی دو نظمیں ''تنہائی'' اور ''انتظار'' کے عنوان سے بھی ہیں۔ فیضؔ کی رومانی شاعری میں جدائی کی خاموش تڑپ ہے ''سرودشبانہ''۔ ''تہہ نجوم''۔ ''یاس'' اور ایک منظر فیضؔ کی مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' میں فیضؔ حقیقت کی طرف آتے ہیں۔ چند روز اور مری جاں فقط چند ہی روز'' ان کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ ''اے دل بے تاب ٹھہر''۔ ''سوچ''۔ ''کتے''۔ ''بول''۔ ''صبح آزادی''۔ ''ترانہ'' ان کی سیاسی نظمیں ہیں۔ قید کے زمانے میں فیض نے بہترین شاعری کی۔ ''نثار میں تری گلیوں پہ'' ۔ ''یاد''۔ ''اے روشنیوں کے شہر''۔ ''ملاقات''۔ ''دریچہ''۔ ''دردآئے گا دبے پاؤں''۔ ''وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' یادگار نظمیں ہیں۔ فیضؔ نے ظلم واستبداد کے خلاف جہاں بھی تحریکیں چلائی گئیں ان کی تائید کی اور ''آجاؤ ایفریقا''۔ ''سرِ وادیٔ سینا'' جیسی نظمیں لکھیں۔ فیض کی شاعری میں قدیم و جدید میلانات کا دلکش امتزاج ملتا ہے۔ وہ کوے یار سے سوے دار تک سفر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سنت منصور وقیس ملتی ہے۔

26.9 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. فیضؔ کی حیات اور کارنامے'' پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. ''فیضؔ کی رومانی شاعری میں تنہائی اور انتظار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں'' آپ اس خیال سے کس حد تک مطمئن ہیں؟ مدلل لکھیں۔
3. ''فیضؔ نے انقلابی نعروں کو شگفتگی عطا کی'' اس خیال کی روشنی میں فیضؔ کی سیاسی شاعری کا جائزہ لیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت ..... '' کا تجزیہ کیجیے۔
2. نظم ''نثار میں تیری گلیوں کے '' کا مرکزی خیال تحریر کیجیے۔
3. فیضؔ کی شاعری کی خصوصیات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

26.10 فرہنگ

الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی
اوج	= اونچائی	بخیہ	= پیوند	بست وکشاد	= چھپا ہوا اور ظاہر
بلوریں	= کانچ کا	بہیمانہ	= سفاکانہ	دُر	= موتی
تنور	= چولھا۔ جس میں دم دیا جاتا ہے	رَن	= میدان جنگ	روزن	= روشن دان
رہزن	= راستے میں لوٹنے والا	سلاسل	= زنجیر	سنگ وخشت	= پتھر واینٹ
شہپر	= چھت	شمشاد	= ایک اونچا درخت	صہباغم	= غم کی شراب
طالع	= قسمت، نصیب	طواف	= اطراف چکر لگانا	کارگہ ہستی	= دنیا
نگوں	= جھک جانا	مدعی	= دعویٰ کرنے والا	مسیحا	= زندہ کرنے والا

26.11 سفارش کردہ کتابیں

1. خلیق انجم — فیض احمد فیض۔ تنقیدی جائزہ
2. شاہد ماہلی — فیض احمد فیض۔ عکس اور جہتیں
3. صابر دت (مرتب) — فیض نمبر۔ فن اور شخصیت
4. فیض نمبر شبستان۔ دہلی
5. ...نمبر۔ افکار۔ کراچی

اکائی 27 : مخدوم ۔حیات' کارنامے' نظم نگاری کی خصوصیات

ساخت

27.1 تمہید
27.2 حیات
27.3 کارنامے
27.4 نظم نگاری کی خصوصیات
27.4.1 عشقیہ رومانی شاعری
27.4.2 سماجی وانقلابی شاعری
27.5 نظم ''اندھیرا''
27.5.1 نظم اندھیرا کا تجزیہ
27.6 نظم ''چاند تاروں کا بن::
27.6.1 نظم چاند تاروں کا بن کا تجزیہ
27.7 نظم ''موت کا گیت''
27.7.1 نظم موت کا گیت کا تجزیہ
27.8 خلاصہ
27.9 نمونہ امتحانی سوالات
27.10 فرہنگ
27.11 سفارش کردہ کتابیں

27.1 تمہید

مخدوم محی الدین اردو کے مقبول اور عظیم شاعر تھے۔مخدوم ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعروں میں سے ایک تھے۔انھوں نے جاگیردارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کی ہے۔اس اکائی میں ہم مخدوم محی الدین کے حالاتِ زندگی' کارنامے اور نظم نگاری کی خصوصیات اور منتخب نظموں کی تشریح پڑھیں گے۔

27.2 حیات

ابوسعید محمد مخدوم محی الدین خذری 4 فبروری 1908 کو قصبۂ اندول ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔مخدوم کی والدہ کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش موسیٰ ندی کے مشہور طغیانی کے سال ہوئی اور اس مصیبت کے وقت ان کی عمر کم وبیش آٹھ ماہ کی تھی۔یہ یادگار طغیانی ستمبر 1908ء میں آئی تھی۔ مخدوم کے خاندان کا سلسلہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے صحابہ میں سے ایک حضرت ابوسعید خذری سے ملتا ہے۔مخدوم کے ددھیالی اجداد میں سے ایک صاحب رشید الدین' شہنشاہ اورنگ زیب کی فوج کے ساتھ اعظم گڈھ سے نقل وطن کر کے حیدرآباد میں ہمیشہ کے لیے سکونت پذیر ہو گئے۔مخدوم کے پردادا مخدوم الدین حیدرآباد کی مکہ مسجد میں مشہور قاری تھے۔مخدوم کے نانا سید جعفر علی 1857ء کی قومی جنگ آزادی کے دوران شمالی ہند (شاہ جہاں آباد' پرانی دلی) سے دکن منتقل ہو گئے اور ضلع میدک میں سکونت اختیار کی۔

مخدوم کے والد غوث محی الدین تعلقہ اندول میں اہلکار تحصیل تھے۔مخدوم ابھی چار برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ماں کی دوسری

شادی کردی گئی۔ان کے چچا بشیر الدین نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔مخدوم کے چچا نے مخدوم کو یہ بات نہیں بتائی کہ ان کی ماں نے دوسری شادی کرلی۔مخدوم کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ان کی ماں زندہ ہے یا مر گئیں۔حیدرآباد آنے کے بعد انھیں پتہ چلا کہ ان کی ماں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ان کے بطن سے ان کی ایک بہن بھی ہے۔مخدوم والدہ کو اپنے گھر لے آئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔مخدوم کے چچا نہایت دین دار اور خدا ترس انسان تھے۔مخدوم کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔مسجد میں خواندگی کے ابتدائی مرحلے سے گزرنے کے بعد اپنے دادا کی رہنمائی میں مخدوم نے قران شریف' سعدی کی گلستان و بوستان پڑھیں۔

مخدوم نے ابتدائی تعلیم اندول کے اسکول اور دھرم ونت اسکول حیدرآباد سے حاصل کی۔1929ء میں سنگاریڈی ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔اسی سال چیلہ پورہ کے شبینہ اسکول سے منشی کا امتحان امتیازی نشان سے پاس کیا۔مخدوم کے چچا کی خواہش تھی کہ مخدوم مولوی بنیں مگر ان کی توقع کے خلاف مخدوم نے عثمانیہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لے لیا لیکن حاضری کی کمی کی وجہ سے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ایک سال ضائع کر کے مخدوم نے 1936ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔اس کے بعد مخدوم نے اپنے رشتہ دار پر اپنے اخراجات کا مزید بوجھ ڈالے بغیر گھر چھوڑ دیا۔وہ ٹیوشن کرنے لگے۔سڑکوں پر اخبار بیچتے' مقبول اداکاروں کی تصویریں بیچتے اور اپنا گزارہ کر لیتے۔رات اکثر مسجد میں گزارتے۔

مخدوم کی شادی 22 'اگست 1933ء کو ان کی چچازاد بہن رابعہ بیگم سے ہوئی۔جن سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔

1934ء میں مخدوم نے بی۔اے اور 1936ء میں ایم۔اے کیا۔ایم۔اے کی تکمیل کے بعد وہ دفتر دیوانی ملکی و مال میں تھرڈ گریڈ کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔1939ء میں مخدوم کا تقرر سٹی کالج میں بحیثیت استاد ہوا۔

1941ء میں انھوں نے خود ہی استعفیٰ دے دیا۔1940ء میں مخدوم کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری چنے گئے تھے۔1943ء میں حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ تشکیل مخدوم کی رہنمائی میں عمل میں آئی۔1945ء میں انھوں نے ایک کل ہند کانفرنس کا اہتمام کیا۔جو بے حد کامیاب رہی۔1942ء سے 1946ء تک کا زمانہ ریاست حیدرآباد میں ایک طوفانی دور تھا۔مخدوم خود کو انقلابی سرگرمیوں کے لیے وقف کر چکے تھے وہ ٹریڈ یونینوں کے ذریعے مزدوروں کو اکٹھا کرنے لگے۔انھوں نے راج بہادر گوڑ' کے ایل مہندرا' حیدر حسن' جوادرضوی اور غلام حیدر کے ساتھ مل کر اپنی سرگرمیاں تیز کردیں۔16 اگست 1946ء کو کل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔اس وقت مخدوم محی الدین روپوش تھے' کیوں کہ ان کی گرفتاری کے احکام جاری ہو چکے تھے۔مخدوم کی غیر قانونی سرگرمیاں 1951ء تک جاری رہیں۔

حصول آزادی کے بعد ملک میں پہلی بار عام انتخابات 1952ء میں منعقد ہوئے۔مخدوم اسمبلی اور پارلیمنٹ دونوں کے لیے امیدوار تھے۔اپنی مقبولیت کے باوجود وہ الیکشن ہار گئے۔1956ء میں وہ قانون ساز کونسل کے امیدوار بنے اور مجلس قانون ساز آندھرا پردیش میں اپوزیشن لیڈر منتخب ہوئے 1952ء سے 1955ء تک مخدوم نے چین' سوویت یونین' مشرقی یورپ کے ممالک اور آفریقہ کا دورہ کیا۔اکتوبر 1968ء میں مخدوم نے سوویت یونین کا سفر کیا اور تاشقند' سمرقند اور بخارا کی بھی سیر کی۔

24 اگست 1969ء کو ان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔وہ ان دنوں دلی میں تھے۔25 'اگست 1969 کی شام کو آٹھ بج کر بارہ منٹ پر مخدوم کا انتقال ہوگیا۔مخدوم کی میت دلی سے حیدرآباد لائی گئی۔ 26 'اگست 1969ء کو ان کی تدفین حضرت شاہ خاموش کے قبرستان میں ہوئی۔

مخدوم کا پہلا شعری مجموعہ ''سرخ سویرا'' 1944ء میں اور گل تر 1961ء میں شائع ہوا۔انتخاب کلام مخدوم (1939) ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد' انتخاب کلام مخدوم (1952ء) انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ' مخدوم اور کلام مخدوم (1972ء) کتب پرنٹرز و پبلشرز کراچی نے اور بساط رقص (1966ء) (جس میں سرخ سویرا اور گل تر کی نظموں کے علاوہ کچھ نئی نظمیں شامل ہیں) جشن مخدوم کمیٹی حیدرآباد نے شائع کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. مخدوم کا اصل نام کیا تھا؟

a) محمد محی الدین b) محی الدین خذری c) ابوسعید مخدوم d) ابوسعید محمد مخدوم محی الدین خذری

2. مخدوم کا تقرر بحیثیت لکچرر کس کالج میں ہوا؟

a) میدک ڈگری کالج b) نظام کالج c) سٹی کالج d) عثمانیہ یونیورسٹی

3. 1952 کے عام انتخابات میں مخدوم اسمبلی و پارلیمنٹ کے لیے امیدوار تھے۔

a) مخدوم دونوں کے لیے منتخب ہوئے b) مخدوم الیکشن ہار گئے c) اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے d) صرف پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہوئے

27.3 کارنامے

1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد ہی حیدرآباد میں بھی نوجوان ادیبوں کا ایک ایسا حلقہ بن گیا تھا جو باقاعدہ انجمن میں شامل تو نہیں تھے لیکن اس کے اغراض و مقاصد سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان ادیبوں کی محفلیں نامور شاعر سروجنی نائیڈو کے مکان گولڈن تھریشولڈ میں ہوا کرتی تھیں۔ ادیبوں کے اس گروہ کے روح رواں مخدوم محی الدین تھے۔ سروجنی نائیڈو ان نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ مخدوم کے ساتھ سوریہ (سروجنی نائیڈو کے فرزند) سبط حسن، اختر حسین رائے پوری، جے۔ وی۔ نرسنگ راؤ۔ عالم خوندمیری، مانک لال گپتا، جواد رضوی اور اونکار پرشاد شامل تھے۔ یہ لوگ ''کامریڈ اسوسی ایشن'' میں شامل ہو گئے۔

تلنگانہ کے دیہاتوں میں بغاوت بھڑک اٹھی تھی۔ مخدوم اس تلنگانہ تحریک کے ہیرو تھے۔ حیدرآباد کے ہندوستان سے الحاق کے بعد بغاوت کی یہ آگ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہوگئی۔ مخدوم مسلح جدوجہد جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ وہ چین کی طرح آزادی حاصل کرنے کے حامی تھے۔ مخدوم کو مہینوں روپوش ہونا پڑا۔ 1951ء میں مخدوم، راج بہادر گوڑ اور دوسرے کمیونسٹ قائدین گرفتار کر لیے گئے۔ 1952ء میں لوک سبھا کے پہلے انتخابات کے پیش نظر تلنگانے میں مسلح بغاوت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ جنوری 1952ء میں مخدوم قید سے رہا ہوئے اور انتخابات میں حصہ لیا۔ وہ الیکشن ہار گئے۔ بعد میں ضمنی انتخابات میں مجلس قانون ساز کے لیے نلگنڈے کے حلقہ حضور نگر سے منتخب کر لیے گئے۔

1953ء میں انھیں عالمی ٹریڈ یونین فیڈریشن بھیج دیا گیا جس کا ہیڈکوارٹر ویانا تھا۔ جہاں انھیں ممتاز سماجی اور سیاسی کارکنوں، امن کے مجاہدوں، شاعروں، ادیبوں، اسکالروں اور مختلف سیاسی جماعتوں اور سماجی طبقات کے نمائندوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ انھوں نے سوویٹ یونین، چین، مشرقی یورپ کے ممالک اور متعدد افریقی ممالک کا دورہ کیا۔ 1954ء میں مخدوم کل ہند ٹریڈ یونین کانگریس کے کلکتہ میں منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت کے لیے ہندوستان واپس آئے۔ اس اجلاس میں انھیں کل ہند ٹریڈ یونین کانگریس کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ مخدوم کو سارے ہندوستان کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ 1957ء میں مخدوم محی الدین پھر ضلع میدک سے پارلیمنٹ کے لیے چناؤ میں امیدوار تھے۔ مگر منتخب نہ ہو سکے۔ وہ ریاست کی مجلس قانون ساز کے لیے منتخب ہوئے اور اپنے انتقال تک کمیونسٹ اراکین اسمبلی کے قائد اور قائد حزب اختلاف کی حیثیت سے کارگزار رہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. مخدوم کس سال گرفتار ہوئے؟

a) 1951 b) 1952 c) 1953

2. مخدوم مجلسِ قانون ساز کے لیے نلگنڈہ کے کس حلقے سے منتخب ہوئے؟

a) حضور نگر b) سوریاپیٹ c) نلگنڈہ d) اچم پیٹ

27.4 نظم نگاری کی خصوصیات

27.4.1 عشقیہ و رومانی شاعری

مخدوم کی شاعری کی ابتدا 1923ء کے لگ بھگ ہوئی جب وہ جامعہ عثمانیہ میں بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ مخدوم فطری شاعر تھے، ان کا فن اکتسابی نہیں وجدانی تھا۔ انھوں نے کسی استاد سے اصلاح نہیں لی۔ علم عروض سے باقاعدہ واقفیت حاصل نہیں کی۔ ان کی پہلی نظم ''پیلا دوشالہ'' ہے۔ مخدوم

کی یہ نظم کافی مقبول ہوئی۔ پہلی مطبوعہ نظم ''طور'' ہے جو رسالہ ''ایوان'' (مدیر مجنوں گورکھپوری) میں 1933ء میں شائع ہوئی۔ مخدوم کے ابتدائی کلام پر جوش، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

مخدوم کی ابتدائی شعری تخلیقات میں ان کی غنائی نظمیں ''تلنگن''۔ ''انتظار''۔ ''ساگر کے کنارے''۔ ''لمحہ رخصت''۔ ''جوانی''۔ ''وہ''۔ ''آتش کدہ اور پشیمانی قابل ذکر ہیں۔ ''ساگر کے کنارے'' میں شاعر نے نیند سے بیدار ہوتے ہوئے ایک گاؤں کی منظر کشی کی ہے۔ ''تلنگن'' میں مخدوم نے گاؤں کی کم عمر حسینہ کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ اس لڑکی کو ''دختر پاکیزگی'' اور ''دشت کی خودرو کلی'' کہتے ہیں۔

پھرنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی اوروں سے شرماتی ہوئی
اجنبی کو دیکھ کر خاموشی مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا
دختر پاکیزگی، نا آشنائے سیم و زر
دشت کی خود رو کلی تہذیب نو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جھک پڑے سب نام ور

اس نظم میں گاؤں کی لڑکی کے لیے اور گاؤں کے باشندوں کے لیے ایک احترام کا جذبہ نظر آتا ہے۔ ان نظموں سے محسوس ہوتا ہے کہ مخدوم کا محبوب خیالی نہیں ارضی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے شاعر نے واقعی محبت کے درد کو محسوس کیا ہے۔ نظم ''لمحہ رخصت'' میں مخدوم کا محبوب اردو شاعری کے روایتی محبوب سے بالکل مختلف ہے جو ستانے اور تڑپانے کے گر جانتا ہے۔

مخدوم کے محبوب میں معصوم کیف ہے جنسی رغبت نہیں ہے۔ فطری تقاضے ہیں، بے اعتدالی نہیں ہے۔ اسی طرح انتظار یا عالم ہجر میں نہ آہوں کا دھواں ہے اور نہ فغاں کے شعلے ہیں۔ یہاں بھی ضبط ہے، تحمل ہے۔ یہ ضبط و تحمل اسی وقت آ سکتا ہے جب شاعر کو اپنی محبت پر بھرپور اعتماد ہو۔

نظم ''آتش کدہ'' میں شاعر خود مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں خودداری ہے۔ وہ اپنی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ بڑی حد تک نرگسیت کا شکار نظر آتا ہے۔ لیکن یہ محبوب زمین سے جڑا ہوا حقیقی انسان ہے۔ مخدوم کی رومانی نظمیں ان کے صحت مند ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ وہ عاشق ہے جس کی ٹھنڈی سانس پر نو آغاز کلیاں اور خوشبودار پھول ملول ہو جاتے ہیں۔ رات کی تنہائیوں میں یہی عاشق اپنی محبوبہ کے بت بنا کر پوجتا ہے اور فردوس خیال میں گیتوں کے جال بنتا ہے۔

سرخ سویرا میں رومانی نظمیں بھی ہیں اور انقلابی بھی۔ لیکن مخدوم کی رومانی شاعری کی عمدہ مثالیں اس شعری مجموعے میں ملتی ہیں۔ غنائی نظموں میں ''وہ''۔ ''جوانی''۔ ''ٹوٹے ہوئے تارے''۔ ''آسمانی لوریاں''۔ ''پچھلے پہر چاند سے''۔ ''یاد ہے'' اور ''زلف چلیپا'' اہم ہیں۔

مخدوم کی رومانی نظموں میں ایک طوفانی محبت کا جوش ہے۔ واقعات کے پس منظر کی تصویر کشی بھی ہے، خارجی دنیا اور نظموں کے کرداروں کی داخلی کیفیت کی کشمکش بھی ہے۔ محبوب کی نگاہوں کی بجلیاں، تبسم کی مٹھاس، موسیقی کی تانیں اور بدن کو جلانے والی آگ بھی ہے لیکن یہ اردو شاعری کے اس رومانی رجحان سے مختلف ہے جس کی نمائندگی اختر شیرانی جیسے رومانی شعرا کرتے تھے۔ مخدوم کی نظموں میں محبوب سے گفتگو اور راز و نیاز کا اظہار راست نہ سہی سرگرشیوں میں ہے، وہ اپنے دل کی بات کہہ جاتے ہیں اور دونوں اسی سماج کا کردار نظر آتے ہیں۔

نظم ''انتظار'' تک آتے آتے مخدوم کی نظموں کا رومانی رنگ دھیما پڑتا جاتا ہے۔ نظم کی نغمگی محبوبہ کے انتظار میں بے چین انسان کے جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ مخدوم کے یہاں دل گرفتگی اور ایک طرح سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نظم کا مشہور شعر ہے۔

رات بھر دیدۂ نم ناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

نظم ''برسات'' میں مناظر قدرت کی تصویر کشی نہیں ہے۔ وہ تنہائی سے چھٹکارا پانے' زندگی کی لذتوں اور احباب کی محفلوں کی طرف لوٹنے کی آرزو کر رہا ہے وہ دوراہے پر کھڑا ہے رہبانیت یا مسرتیں.....؟ وہ اعلیٰ مقصد کی تکمیل کو ترجیح دیتا ہے۔ جو اس نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔

سرخ سویرا کی اشاعت کے سترہ برس بعد مخدوم کا دوسرا مجموعہ کلام ''گل تر'' اگست 1961ء میں شائع ہوا۔

مجموعہ ''گل تر'' میں اپنے افکار کے نتائج اخذ کرتے ہوئے اور ناکام امیدوں پر افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے مخدوم پھر محبت کے موضوع کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ مگر اب ذہنی پختگی اور دانش مندی' ان کو شاعری اور کائنات' تخلیق اور زندگی کے نامیاتی تعلق کو ہمیشہ نظر میں رکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے مخدوم کی رومانیت اب اونچی سطح کی تھی۔ محبت اب انفرادی جذبہ یا دو شخصیتوں کا ملاپ نہیں تھی بلکہ مخدوم نے محبت کی ہمہ گیری اور عالم گیریت کو محسوس کر لیا تھا۔ اور محبت کو سارے عالم پر بسیط جذبہ سمجھنے لگے تھے۔

نظم ''چارہ گر'' انھوں نے اپنے سماجی شعور کی پختگی کی اس منزل پر پہنچ کر لکھی جہاں وہ اپنے ذہنی ارتقا سے مطمئن ہو کر زندگی اور کائنات کے متعلق اپنے شعور کی گہرائیوں سے خیالات کے موتی چن چن کر لا سکتے تھے۔ اس نظم کا موضوع وہی ازلی و ابدی واقعہ محبت ہے جو ہر دور میں ہر نظام و معاشرے میں موجود رہا ہے۔ ازل تا ابد دو بدن پیار کی آگ میں جل رہے ہیں۔ پیار حرف وفا ہے۔ پیار ان کا خدا ہے۔ پیار چاہنے والوں کی چتا ہے۔ سماج اور معاشرہ کوئی بھی ان کو بچا نہ سکا۔ کوئی ایسا چارہ گر پیدا نہ ہو سکا جس کی زنبیل میں نسخہ کیمیائے محبت ہو اور جو علاج و مداوائے الفت جانتا ہو۔ محبت کی یہی ہمہ گیری' جاں سپردگی اور بے نفسی اس کو جدوجہد کے مماثل بناتی ہے۔

''آج کی رات نہ جا'' میں مخدوم لمحہ موجود میں' جینے اور اس سے بھرپور لطف اٹھانے کے لیے کہتے ہیں۔ وہ زندگی کو اس کے روشن اور تاریک پہلوؤں کے ساتھ قبول کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آب حیات لب و رخسار بھی ہے

آج کی رات نہ جا

مخدوم کہتے ہیں کہ زندگی زندہ رہنے اور مسکرانے کے لیے ہے۔ اس نظم کی فضا رومانی ہے اور شاعر نے زندگی کے حقیقی تجربوں کو اشعار میں ڈھالا ہے۔

مخدوم کی نظم ''رقص'' بھی محبت سے منسوب ہے۔ اس نظم میں سرشاری اور مستی کی کیفیت ہے۔ اس کا خاص وصف ترنم ہے۔ آزاد نظم کے فارم میں کہی جانے والی اس نظم میں ترنم اور رواں بحروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ لفظوں کی تکرار سے جھنکار پیدا ہوتی ہے اور ایک صوتی آہنگ ہے جو موسیقیت پیدا کرتا ہے۔ اس نظم کا تمام تر حسن ایمائیت' اشاریت' علامت اور اختصار میں ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں مخدوم نے تین الفاظ کا استعمال کیا ہے یعنی روپ' رنگ اور راگ پھر ان لفظوں کی تجسیم کی ہے۔ روپ اور رنگ کو چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپی ہوئی اور سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوئی جوانیوں سے مشکل کیا گیا اور راگ تیسرے منظر میں مہکتے بدن' لچکتی کمر اور بہکتے قدم سے تشکیل پا رہا ہے۔ مخدوم نے نئی اور اچھوتی تراکیب کا استعمال کیا۔ ''صدائے تیشہ'' اور ''بساط رقص'' کی تراکیب اردو شاعری کی عمدہ تراکیب میں سے ہیں۔ (مخدوم نے اپنے کلیات کا نام ''بساط رقص'' اسی نظم سے لیا تھا)

الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہ کن کی جیت ہو

نظم دعا پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں ہندو دیو مالا کا خدائے محبت کام دیو بھی ہے اور مشرق وسطیٰ کی رزمیہ شاعری کا عاشق ہیر و فرہاد بھی ہے۔ مخدوم ایک انفرادی جذبۂ محبت کے اظہار کو ایک عالمی اور ابدی مفہوم دے کر اسے آفاقی تصور عطا کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ احساس کی رات' سناٹا' جانِ غزل' خواہشیں' وصال اور وقت بے درد مسیحا'' کا موضوع بھی محبت ہے۔مخدوم نے اندرادھن راج گیر جی کی دو نظموں کا انگریزی سے ترجمہ کیا لیکن یہ دراصل اندرادھن راج گیر جی کی نظموں کے موضوعات پر لکھی گئیں طبع زاد نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں ''فاصلے'' اور ''ہم دونوں'' ہیں۔

نظم ''احساس کی رات'' میں ایک خوف ہے کہ وہ کہیں محبت سے محروم نہ ہو جائے کیوں کہ ہوس کی یلغار ہے' دھماکے اور بگولے ہیں۔اسے خوف ہے کہ کہیں شفقِ زیست کی پیشانی کا رنگین قشقہ اور رنگ جبیں کہیں اڑ نہ جائے۔نقش و فامٹ نہ جائے اور یہ بجتا ہوا ساز چپ نہ ہو جائے۔اس نظم کی فضا افسردہ ہے۔وسوسے اور خدشات ہیں لیکن آرزو بھی ہے۔

میرے دل اور دھڑک

شاخِ گل

اور مہک اور مہک اور مہک

''احساس کی رات'' کا آغاز ایک اندیشے سے ہوتا ہے

مجھے ڈر ہے کہ کہیں سرد نہ ہو جائے یہ احساس کی رات

نظم ''وقت۔بے درد مسیحا'' میں مخدوم نے اسی موضوع کو آگے بڑھایا ہے اور بڑی حد تک ''چارہ گر'' کے سوالوں کا جواب دیا ہے۔

مخدوم اپنی آخری رومانی نظموں میں ایک تشکیک اور افسردگی کا شکار ہو گئے تھے۔نظم ''فریاد'' میں روحانی اکیلے پن کی شکایت ہے۔ایک دوسرے کو سمجھ نہ پانے کا گلہ ہے۔وہ محبت کے قائل تھے۔محبت پر ان کا ایقان مضبوط ہوتا گیا۔نظم ''لختِ جگر'' میں لکھتے ہیں۔

محبت کو تم لاکھ پھینک کر آؤ گہرے کنویں میں

مگر ایک آواز پیچھا کرے گی

کبھی چاندنی رات کا گیت بن کر

کبھی گھپ اندھیرے کی پگلی ہنسی بن کر

پیچھا کرے گی

بساطِ رقص کی آخری دو نظموں ''واسوخت'' اور ''رُت'' لہجہ مایوسی میں ڈوبا ہوا ہے۔

شاعر جو اپنی ابتدائی نظموں میں اعتماد و وفا اور اعتماد محبت کی ترجمانی کرتا ہے وہ استفہامیہ لب و لہجہ اختیار کرتا ہے۔شکوک و شبہات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ بیش تر مسائل رجائی انداز میں سلجھانا چاہتا ہے لیکن ایک اضطراب ایک بے چینی ہے مگر وہ ضبط کا دامن کہیں نہیں چھوڑتا۔

اس کیفیت کو شاذ تمکنت اس طرح واضح کرتے ہیں

''مخدوم کی شاعری کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ 1) تراشیدم 2) پرستیدم 3) شکستم

'طور' سے 'جز تیری آنکھوں تک' شاعر تراشیدم اور پرستیدم کے دل نواز مراحل سے گزرتا رہا جہاں اس نے چاہا اور چاہا گیا۔بساطِ رقص کی آخری نظموں ''واسوخت'' اور ''رت'' کا لہجہ یکسر بدلا ہوا ہے جسے ہم شکستم سے تعبیر کرتے ہیں۔

لیکن سراسر غنائی نظموں میں بھی مخدوم کے خیالات کا عکس صاف نظر جھلکتا ہے اور ایک ترقی پسند شاعر پورے وجود کے ساتھ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

مات کی جانچ:

1. مخدوم کی پہلی مطبوعہ نظم ''طور'' کس رسالے میں شائع ہوئی؟

a) نگار b) ایوان c) نیا ادب d) پیام

2. کون سا مجموعہ کلام مخدوم کا نہیں ہے؟

a) سرخ سویرا b) گلِ تر c) بساطِ رقص d) نقشِ فریادی

3. کس نظم کا مصرعہ ہے؟ ع رات بھر دیدۂ نم ناک میں لہراتے رہے۔

a) انتظار b) زلفِ چلیپا c) سجدہ d) لمحہ رخصت

27.4.2 سماجی وانقلابی شاعری

مخدوم کی ابتدائی تخلیقات میں سماجی موضوعات شامل ہو گئے۔ان کی پہلی سیاسی نظم ''جنگ'' ہے۔جس کو سبط حسن نے فاشزم کے خلاف اردو کی پہلی صدائے احتجاج قرار دیا۔ 1935 میں جرمنی نے حبشہ کے خلاف غاصبانہ جنگ چھیڑ دی تھی۔ساری دنیا کی جمہوریت پسند طاقتوں نے اس حملے کی مذمت کی تھی۔ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ 1936ء لکھنؤ میں اس حملے کے خلاف قرارداد منظور کی گئی تھی اور حبشہ کے عوام اور ان کی جدوجہد آزادی کی حمایت کی گئی تھی۔نظم ''جنگ'' اخبار ''پیام'' (مدیر قاضی عبدالغفار) کے پہلے صفحے پر شائع ہوئی تھی۔اس سے قبل پہلے صفحے پر صرف میر عثمان علی خاں کا کلام ہی شائع ہوا کرتا تھا۔اس نظم میں مخدوم نے تباہی و بربادی کی تصویر کھینچی ہے۔

''جنگ'' کی تخلیق کے بعد مخدوم سماجی و سیاسی موضوعات کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ہسپانیہ کی جنگ کے پس منظر میں مخدوم نے نظم ''دھواں'' لکھی۔

دھواں کے کچھ ہی عرصہ بعد انھوں نے نظم ''اندھیرا'' لکھی جو مخدوم کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔مخدوم نے 'دھواں' کے ہی موضوع کو آگے بڑھایا ہے۔شاعر ویرانی اور فسطائیت کے ہاتھوں پھیلی ہوئی تباہی' بربادی اور موت کی دہشت ناک تصویر کھینچتا ہے۔اسے ساری دنیا دہشت زدہ نظر آتی ہے۔پوری نظم ایک تصویر معلوم ہوتی ہے۔

مخدوم نے یہ نظم کسی مخصوص جنگ کے خلاف نہیں لکھی تھی بلکہ جنگ کے خلاف ابدی صدائے احتجاج بلند کیا تھا۔اس نظم کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ شاعر نے کسی مخصوص واقعے' کسی مخصوص ملک اور عوام کو موضوع نہیں بنایا بلکہ آزادی کے متوالے سبھی مجاہدوں کی آرزؤں کی عکاسی کی ہے۔''اندھیرا'' مخدوم کی بہت ہی مقبول نظم ''جنگ آزادی'' کا پیش خیمہ تھی۔''جنگ آزادی'' نے مزدوروں اور محنت کشوں میں ایک انقلابی ترانے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔یہ انقلاب صرف ہندوستان کے محنت کش اور مزدوروں کی آرزؤں اور خوابوں کا گہوارہ تھا۔مخدوم کسی خاص نسل وقوم سے مخاطب نہیں ہیں بلکہ ایک عالم گیر انسانیت کے علم بردار بن جاتے ہیں۔

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

اس جنگ میں ہندوستانی عوام اکیلے نہیں ہیں۔متعدد ملکوں کے باشندے مظلوم ہندوستانی عوام کے ساتھ بین الاقوامی یگانگت کے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں روس پر جرمنی کے حملے سے پہلے مخدوم نے نظم ''سپاہی'' لکھی۔ہندوستان برطانیہ کی حکومت کے زیر اثر تھا اور عوام کی مرضی کے خلاف ہندوستانی سپاہیوں کو عالمی جنگ میں دھکیلا جا رہا تھا۔ہندوستانی نوجوانوں پر ایک تذبذب کی کیفیت طاری تھی۔مخدوم محی الدین نے ہندوستانی سپاہی کو مخاطب کر کے نظم ''سپاہی'' لکھی جو غیروں کے مفاد کی حفاظت کے لیے جنگ پر روانہ ہو رہا تھا۔

جانے والے سپاہی سے پوچھو

وہ کہاں جا رہا ہے

قوم کی مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور سپاہی کو وہ آنے والے واقعات کی جھلک دکھاتے ہیں۔اس کی ماں یا بیوی بے سہارا ہو رہی ہے' خاندان کی پرورش کرنے والے کے بغیر بچے بھوکے سونے پر مجبور ہو رہے ہیں۔موت کا اندیشہ ہے۔مخدوم موت کی تجسیم میں پورے حواس بیدار کرتے ہیں۔چتا کا تصور' لاش جلنے کی بو' زندگی کا چلانا.....محاذ جنگ پر جاتے ہوئے سپاہی کو پیش آنے والے واقعات جہاں سہمے ہوئے تارے' دریائے خوں میں غرق جوانی اور ایسی عورتیں ہیں جن کی زندگی میں سناٹا ہے اور تنہائی جن کا مقدر ہے۔

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلا رہی ہے
جانے والے سپاہی سے پوچھو

مخدوم کی شاعری میں زوال آمادہ معاشرے میں غیر منصفانہ نظام کی مذمت اور انسانوں پر مسلط کردہ جنگ کے خلاف نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ مخدوم کی ایسی نظمیں جن میں ان کا سماجی شعور واضح ہے' ان میں 'حویلی'۔'مشرق'۔'باغی' اور تلنگانہ قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان کے عوام غیر ملکی ظالموں کے علاوہ خود اپنے زمیں داروں' راجاؤں' نوابوں' سرمایہ داروں اور سود خوروں کے جبر و تشدد کا شکار تھے۔ترقی یافتہ مغرب اور گہری نیند میں ڈوبے ہوئے مشرق کے درمیان ایک واضح فرق ہے۔جب تک مشرق کو اپنے استحصال اور پسماندگی کا احساس نہ دلایا جائے وہ آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔مخدوم نظم ''مشرق'' میں نہ صرف تلخ افکار کا اظہار کرتے ہیں بلکہ 'نیا آدم' کا تصور بھی دیتے ہیں۔

مخدوم کہتے ہیں مشرق' مغربی چیلوں کا لقمہ ہے' ایک قبرستان ہے' ایک بھٹکتی روح ہے' ماضی کا ایک بے رنگ و بے روح خول ہے' ایک بے آواز ڈھول ہے' ایک مسلسل رات ہے جس کی کوئی صبح نہیں ہے۔مخدوم کو یہاں مسلسل غلامی' بھوک' غریبی' بے روزگاری' ظلم و استبداد' زندگی کی قدامت اور بجھا ہوا پن نظر آتا ہے۔وہ کہتے ہیں:

اس زمین ِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا ' نا آدم بنایا جائے گا

مخدوم نے اس خیال کو زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنی نظم 'جہان نو' میں پیش کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ مستقبل اس تاریک ماضی سے مختلف ہوگا۔وہ ایک نئی دنیا کا تصور پیش کرتے ہیں۔

'حویلی' مخدوم کی اہم نظم ہے۔'حویلی' جاگیردارانہ نظام کی علامت ہے۔ایک فرسودہ سماج کی نمائندگی کرتی ہے۔یہ حویلی رہزنوں کا قصرِ شوریٰ اور قاتلوں کی خواب گاہ ہے۔اس کی چھت کے نیچے جرائم پناہ لیتے ہیں۔اور انصاف پر کھلکھلا کر ہنستے ہیں اور گناہ خوشیاں مناتے ہیں۔

حویلی کے آس پاس گداؤں اور بے نواؤں کے گروہ' برہنہ پا اور اپاہجوں' بدقسمت کنگالوں کا ہجوم ملتا ہے جن کے دل کچلے ہوئے ہیں۔وہ نئے دو جہاں سے لہتا ہے کہ ذرا اپنے شاہکار یعنی انسان کا حشر دیکھ کہ کس طرح اس کی قلب ماہیت ہوگئی کہ ملبوس دین بھی معاشرے کے کوڑھ کے دھبے چھپا نہیں سکتا۔شاعر اس جہان نو سے جو اپنے جلو میں بجلیاں اور زلزلے لے کے آ رہا ہے خواہش کرتا ہے کہ وہ ایسا نغمہ چھیڑ دے جس سے زندگی مسکرائے اور کہتا ہے۔

آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں
آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

جوش ملیح آبادی نے جنھیں ''شاعرِ انقلاب'' کہا جاتا ہے اپنی شاعری میں گرج، بجلی، تلوار، تیر، آگ، شعلے اور تباہی جیسے الفاظ استعمال کیے تھے۔ جن کا اثر ان کے بعد والے رومانی شاعروں نے بھی قبول کیا۔ اس دور میں ایسی نظمیں لکھی گئیں جن میں فرسودہ نظام کو ڈھا دینے کی ترغیب دی گئی اور اس کا متبادل کوئی نظام نو پیش نہیں کیا گیا۔ مخدوم کی ابتدائی نظموں میں بھی یہ رجحان ملتا ہے جس کا واضح اظہار انھوں نے نظم ''باغی'' میں کیا۔

سماجی ناانصافی کے خلاف مخدوم کی ایک خوبصورت نظم ''زلف چلیپا'' ہے۔ ''زلف چلیپا'' مخدوم کی شاعری کا ایک موڑ ہے۔ یہ نظم ان کی ابتدائی نظموں سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ مخدوم نے راست خطابت کی بجائے استعاراتی زبان کا استعمال کیا ہے۔ ''زلف چلیپا'' کی برہمی کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہندوستان میں عیسائیوں (انگریزوں) کے اقتدار کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ سرمایہ داری کے ہاتھوں فرق گیتی پر رکھے کانٹوں کے تاج کا استعارہ یہ بتاتا ہے کہ ہندوستانی عوام پر ظلم کرنے والے کہاں سے آئے۔ مخدوم صاف لفظوں میں ہندو، مسلمان اور عیسائی پر کیے گئے ظلم کا اظہار نہیں کرتے بلکہ مندروں، معبدوں اور کلیساوں میں موت سے اشارہ کرتے ہیں۔

ہندوستان کی سرزمین کو وہ ایسی زمین جہاں ارتقا کے انبیا پیدا ہوئے، جہاں علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے، رام و لچھمن کی زمین، کرشن کی، گوتم کی زمین، محمدؐ کی زمین، ابن مریم کی زمیں کہتے ہیں۔

مخدوم نے موضوعاتی نظمیں قحط بنگال پر ''بنگال'' تلنگانہ تحریک پر ''تلنگانہ'' لکھی۔ نظم ''بنگال'' میں انھوں نے نہ صرف قحطِ بنگال کی بھیانک تصویر پیش کی بلکہ انھوں نے عوام کو بلا لحاظ مذہب و ملت متحد ہو جانے کی دعوت دی۔

1951ء میں مخدوم کو سنٹرل جیل حیدرآباد میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ مخدوم نے جیل میں نظم ''قید'' لکھی۔ 'قید' میں رات کی خاموشی اور تنہائی ہے ظلم و جور کی شکایت کرنے والا شاعر شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی آواز سنتا ہے۔ اس کا دماغ چونک اٹھتا ہے۔ شبستان خیال جاگ اٹھتی ہے۔ اسے گزری ہوئی ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ وہ جیل سے باہر سانس لینے والے سینکڑوں عوام کی غمگین آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے، جو جورِ شاہی اور جبر سیاست سے نڈھال ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ یہی عوام ایک دن دھماکہ بن جائیں گے۔ تب سلطانی رہے گی نہ قیصری رہے گی اور نہ تختِ شاہی..... آخری مصرعے میں اس کی اپنی سوزشِ غم کا پتہ چلتا ہے۔ نظم ہم کلامی سے شروع ہوتی ہے اور ہم کلامی پر ختم ہوتی ہے۔

مجھے غم ہے کہ میرا گنج گراں مایۂ عمر
نذر زنداں ہوا
نذر آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا ؟

1958ء میں مخدوم نے مشہور نظم ''چاند تاروں کا بن'' لکھی۔ ہندوستانی معاشرے کے تاریخی ارتقا کے تین دور انھوں نے علامتی انداز میں پیش کیے۔ ''چاند تاروں کا بن'' اردو کی سیاسی و انقلابی شاعری کی ایک بے حد عمدہ مثال ہے۔ اس میں جذبہ فکر اور نظر یہ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک ایک لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ مخدوم نے موضوع کو جس ضبط، وقار احتیاط اور آہنگ کے ساتھ برتا ہے آزادی کے موضوع پر لکھی گئی نظموں میں یہ سب سے عمدہ نظم ہے۔ اس نظم میں مخدوم کی سیاسی و عوامی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔

''سناٹا'' مخدوم کی مختصر لیکن پر اثر نظم ہے۔ شاعر گرد و پیش کے ماحول میں کوئی ہلچل کوئی دھڑکن محسوس نہیں کرتا۔ لوگ کاروباری ذہن کے ہو گئے ہیں۔ زندگی میں وہ اضطراب، تڑپ، سچا جذبہ اور کوئی نصب العین چاہتا ہے اس لیے وہ کہتا ہے۔

کوئی رخسار تو چمکے کوئی بجلی تو گرے

گل تر کے بعد ''بساطِ رقص'' کلیات کی صورت میں دسمبر 1966ء میں شائع ہوا۔ بساطِ رقص کی اشاعت کے تین برس بعد تک مخدوم بقید حیات رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے ''دُرّہ موت''، ''مارٹن لوتھر کنگ''، ''چپ نہ رہو''، ''ملاقات'' لکھیں۔ ''درہ موت'' کا ذیلی عنوان ''ویت نام کے پس منظر میں'' ہے۔

مخدوم کو کبھی ویت نام جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن انھوں نے اس نظم میں تباہی و بربادی کی ایسی سچی تصویر کھینچی ہے جیسے انھوں نے خود مشاہدہ کیا ہو۔ وہ بالراست امریکی سپاہیوں کی درندگی کے بارے میں نہیں کہتے، سمندر پار سے آنے والوں کی مذمت نہیں کرتے قاری خود ہی سمجھ جاتا ہے کہ اس بری

بھری وادی کو درہ موت میں کس نے تبدیل کیا' درہ موت کے فوراً بعد انھوں نے مختصر سی نظم ''مارٹن لوتھر کنگ'' لکھی۔ مخدوم نے علامت اور استعاروں سے کام لیے بغیر صحافتی انداز میں قاتلوں کی مذمت کی ہے۔

''چپ نہ رہو'' کانگو کے قائد وزیر اعظم اور آزاد آفریقہ کی علامت پیٹرس لومبا کے قتل پر لکھی گئی نظم ہے۔ اس کا اختتام بھی احتجاج پر ہوتا ہے۔

مخدوم محبت و محنت کے شاعر ہیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

صدائے تیشہ کامراں ہو' کوہکن کی جیت ہو

اپنی معلومات کی جانچ:

1. مخدوم کی پہلی سیاسی نظم ..... ہے (جنگ' دھواں' اندھیرا)
2. ''نظم ..... نے مزدوروں اور محنت کشوں میں ایک انقلابی ترانے کی حیثیت اختیار کر لی تھی'' (مستقبل' سپاہی' جنگ آزادی)
3. صحیح جواب کی نشان دہی کیجیے۔

a) مخدوم محبت و محنت کے شاعر تھے۔

b) مخدوم محبت و حقیقت کے شاعر تھے۔

c) مخدوم مصیبت و محنت کے شاعر تھے۔

d) مخدوم نصیحت و محنت کے شاعر تھے۔

27.5 نظم ''اندھیرا''

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے یہی اِن کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
''وہ تہذیب کے زخم''
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ ترختے ہوئے سر
میتیں ہاتھ کٹی' پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا

کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

27.5.1 نظم اندھیرا کا تجزیہ

''اندھیرا'' مخدوم کی ایک اہم نظم ہے۔ یہ ''سرخ سویرا'' کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم وحشت اور بربریت کی تصویر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مخدوم کی لکھنے پڑھنے کی میز پر مشہور مصور پکاسو کی تصویر ''گیرنیکا'' کی نقل آویزاں رہتی تھی۔ اور نظم 'اندھیرا' میں دراصل انھیں خیالات کو الفاظ میں ظاہر کیا گیا تھا۔ مخدوم نے ویرانی' فسطائیت اور فسطائیت کے ہاتھوں پھیلی ہوئی تباہی اور موت کی دہشت ناک تصویر کھینچی ہے۔ مخدوم نے بڑی خوب صورت پیکر تراشی کی ہے۔

رات کے ہاتھ میں اک کاسہ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے یہی ان کا کفن

یہ اندھیرا سرمایہ دارانہ نظام کا ہے جہاں ہر چیز مانگے کی ہے۔ اس اندھیرے نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس کے بعد شاعر لفظوں سے بربریت کی تصویر کھینچتا ہے۔

اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
''وہ تہذیب کے زخم''
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ ترختے ہوئے سر
میتیں ہاتھ کٹی' پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا

پورا ایک منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ظلم اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے' ہر طرف جاں کنی کی تکلیف میں تڑپتی ہوئی انسانی تہذیب کے زخموں سے رستا ہوا خوں بہہ رہا ہے۔ انسانی تہذیب زخمی ہے۔ پھر جنگ کے لوازم ہیں۔ خندقیں' باڑھ کے تار' باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم' اور انسانوں کے جسموں پہ بیٹھے ہوئے گدھ..... جنگ کا ہولناک منظر ہے۔ باڑھ کے تارے..... سرحدوں کی علامت جہاں زمینیں تقسیم ہوتی ہیں۔ گدھ..... انسانی مردوں کو نوچنے والا پرندہ..... مردار کھانے والوں کی علامت' ترختے ہوئے سر' ادھوری میتیں' انسانی اعضا بکھرے ہوئے۔ تصویر کے بعد محسوسات

کے دائرے میں نظم داخل ہوتی ہے۔

لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تک

سرد ہوا

اس سرد ہوا کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو ڈھانچے کے آر پار گزر رہی ہے۔ یہ سردی..... انسانوں کی سرد مہری جو رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ یہ ہوا' نوحہ و نالہ و فریاد کر رہی ہے۔ انسانیت پر لگے زخموں کا واویلا کر رہی ہے۔ رات کے سناٹے میں رونے کی صدا آ رہی ہے۔ کبھی بچوں کی جو یتیم ہو گئے' کبھی ماؤں کی جن کے بیٹے چھن گئے۔ چاند اور تارے بھی ماتم کناں ہیں۔ انسان کے ظلم اور بربریت پر فطرت ماتم کر رہی ہے..... نظم کے آخری میں ایک مصرعے کی تکرار وحشت اور بربریت کے اس المناک اور اداس تصویر کے تاثر کو اور گہرا کر دیتی ہے۔

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

لیکن ان آخری مصرعوں سے قبل مخدوم ایک نئی صبح کی بشارت دیتے ہیں۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم

صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

شاعر اس اندھیرے کو دائمی نہیں سمجھتا۔ وہ جانتا ہے سورج ضرور نکلتا ہے۔ وہ خوب صورت پیکر تراشی کرتا ہے رات کا ماتھا اور آزردہ ستاروں کا ہجوم جیسے جھومر..... چاند' تارے' ستارے' خورشید

اور صوتی اعتبار سے ت کی تکرار' تاروں' ماتم' رات' ماتھے' ستاروں اور تک ایک خوبصورت آہنگ بناتے ہیں۔ نظم میں ساتویں مصرعے سے بحر تبدیل ہو جاتی ہے اور آہنگ ہیجانی ہو جاتا ہے۔ ایک لفظ پر مشتمل ایک مصرعہ اور پھر طویل مصرعے:

وہ تہذیب کے زخم

خندقیں

باڑھ کے تار

اور اس کے بعد

باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم

اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ

نظم کے آہنگ کو موضوع سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ ہاتھ کٹی' پاؤں کٹی لاشیں' خندقیں' خاردار تاروں کی باڑھ' انسان کا گوشت نوچتے ہوئے گدھ۔ اردو شاعری کے لیے یہ الفاظ بالکل نئے تھے۔ جیسا کہ کہا گیا یہ نظم مخدوم نے اس دور میں لکھی جب روس پر جرمنی نے حملہ کیا تھا۔ انسانیت کا قافلہ نئے موڑ پر آ گیا تھا۔ ملک کی فضا میں عوامی جنگ کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ مخدوم کے ہاں طلوعِ آفتاب اشتراکیت کے دور کا آغاز ہے۔ اس نظم میں مخدوم نے اک نئی صبح پر غیر متزلزل اعتقاد کا اظہار کرتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. 'اندھیرا' میں مخدوم نے..... کی تصویر کھینچی ہے (وحشت و بربریت' دو پیار کرنے والوں' جنگ پر جانے والے سپاہی)
2. اس نظم میں..... مصرعے سے بحر تبدیل ہو جاتی ہے۔ (ساتویں' پانچویں' تیسرے)
3. کون سے مصرع کو دہرایا گیا؟

a) میتیں ہاتھ کٹی پاؤں کٹی

b) رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم

c) رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

27.6 نظم ''چاند تاروں کا بن'' (آزادی سے پہلے، بعد اور آگے)

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر

تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مردوزن
مستیاں ختم، مدھوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خارزارِ الم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا
کچھ اماماں صدمکر و فن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمین گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

تلچھٹیں ہیں اندھیرا ابھی ہے
صبح کا کچھ اُجالا، اجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

27.6.1 نظم چاند تاروں کا بن کا تجزیہ

1958ء میں مخدوم نے اپنی مشہور نظم ''چاند تاروں کا بن'' لکھی۔ انھوں نے نظم میں ذیلی عنوان ''آزادی سے پہلے' بعد اور آگے'' دیا ہے اور ہندوستانی معاشرے کے تاریخی ارتقا کے تین ادوار کے بارے میں علامتی انداز میں اظہار کیا ہے۔ پیرائے اظہار کی وجہ سے ایک اچھوتی اور متاثر کن نظم ہے۔ نظم کا لہجہ انقلابی اور پر جوش نہیں ہے۔ مخدوم نے روایتی نعرہ بازی سے کام نہیں لیا۔ مخدوم ترقی پسندوں کے کارواں میں شامل تھے۔ لیکن اپنے منفرد انداز کی بنا پر سب سے الگ تھلگ تھے۔ ان کی آواز منفرد تھی چاند تاروں کا بن اس کی روشن مثال ہے۔

مجاہدین آزادی موم کی طرح پگھل پگھل کر وطن کے اندھیرے کو روشنی میں بدل دینے کی کوشش کرتے رہے۔ آزادی کے دیوانوں نے سختیاں برداشت کیں، تشنگی تھی مگر تشنگی میں بھی سرشار تھے۔ مرد و زن پیاسی آنکھوں سے آزادی کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن خوابوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا' مستیاں' مدہوشیاں اور بانکپن سب ختم ہو گئے۔

دوسرے حصے میں وہ کہتے ہیں رات کے اندھیرے میں جو بدن دہک رہے تھے جگمگا رہے تھے وہ اجالا ہوتے ہی صبح دم دیوار غم بن گئے کیوں کہ رات کی شرگوں میں اچھلتا لہو جوے خون بن گیا۔ مخدوم کا اشارہ قیامت خیز فسادات کی طرف ہے۔ جو حصول آزادی کے مرحلے پر اور بعد دیکھے گئے۔ دیوارِ غم تقسیم کے المیے کی علامت ہے۔ خارزارِ الم بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ رات نے جاتے جاتے خون کی ندیاں بہا دیں۔ وہ خون جو رات کی شرگوں میں اچھل رہا تھا۔ وہ جوش و خروش غلط سمت مڑ گیا۔ اور یہ سب کچھ امامانِ صد فکر و فن نے کیا۔ جن کی سانسوں میں سانپ کی زہریلی پھنکار تھی۔ جن کے سینوں میں نفرت کا کالا دھواں تھا۔ انھوں نے اپنی نوک زبان سے نورِ سحر کا خوں پی لیا۔

آخری بند میں شاعر ماضی سے حال میں لوٹ آتا ہے۔ اب جو کیفیت ہے اس میں رات کی تلچھٹیں بھی ہیں۔ اندھیرا ابھی ہے اور کچھ اجالا بھی ہے۔ اندھیرا پوری طرح سے ختم نہیں ہوا۔ یہ اندھیرا روس میں طلوع اشتراکیت کے بعد بھی نظر آتا ہے۔ آفریقہ' ایشیا اور لاطینی امریکہ کے بیسوں ممالک میں آزادی پانے کے بعد بھی ہے۔ مخدوم جدوجہد کو مکمل نہیں سمجھتے۔ انسانوں کو اپنے دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلنا ہے۔ مخدوم کے سامنے ایک سفر اور مسلسل سفر ہے۔

مخدوم کی اس نظم کا حسن اس کی رمزیت میں چھپا ہوا ہے۔ اگر عنوان کے نتیجے قوسین میں آزادی سے پہلے بعد اور آگے لکھا نہ ہوتا تو اس نظم کو سیاسی کہنا بھی مشکل ہوتا۔

نظم کا عنوان ''چاند تاروں کا بن'' یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ رات کی سیاہی میں چاند تاروں کی جھرمٹ روشنی کی علامت ہے۔ روشنی ظلمت سے برسرِ پیکار ہے۔ پوری نظم میں صرف ایک جگہ لفظ وطن کا استعمال کیا گیا ورنہ پوری نظم علامتی ہے۔ پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے' جوئے خوں' افعی کی پھنکار' نفرت کا کالا دھواں' خونِ نورِ سحر' رات کی تلچھٹیں خوبصورت اچھوتی ترکیبیں ہیں۔

شعریت اور غنائیت کے اعتبار سے بھی یہ ایک اہم نظم ہے۔ پہلے تین مصرعوں میں تن' وطن' بن ان تینوں مصرعوں کے ہم وزن و ہم قافیہ ارکان نے ایک فضا قائم کر دی ہے۔ چوتھے مصرعے میں سوال ہے۔

تشنگی تھی مگر

پہلا بند آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے تین مصرعے ہم قافیہ' آخری دو مصرعوں میں بھی شاعر نے نون پر ختم ہونے والے قافیے باندھے ہیں۔

اس کے بعد والے بند کا پہلا مصرعہ حرفِ نون کے قافیے پر ختم ہوتا ہے۔

رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

پھر دم، غم، الم اور اس کے ساتھ ردیف ''بن گئے'' سے خوبصورت صوتی آہنگ بنتا ہے۔ تیسرے بند کا پہلا مصرعہ پھر نون پر ختم ہوتا ہے۔

کچھ امامانِ صد فکر و فن

اس بند میں بھی دھواں، زماں کے قوافی صوتی آہنگ میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس بند کا آخری مصرعہ ''خون نور سحر پی گئے'' پورے بند کو سمیٹ لیتا ہے۔ آخری بند نغمگی، ترنم، صورت و آہنگ کی بہترین مثال ہے۔ نون اور نون غنہ کے استعمال سے اس نظم میں غنایت عروج پر نظر آتی ہے۔

اس نظم کا اختتام ''چلو'' پر ہوتا ہے یعنی حرکت و عمل کی ترغیب پر نظم ختم ہوتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظم ''چاند تاروں کا بن'' کا لہجہ انقلابی اور پر جوش نہیں ہے بلکہ اس میں

a) رمزیت ہے b) پروپگنڈا ہے c) نعرہ بازی ہے

2. ''چاند تاروں کا بن'' میں مخدوم

a) ایک نئے سویرے کا اعلان کرتے ہیں

b) ایک نئے آدم کی آمد کی بشارت دیتے ہیں۔

c) جدوجہد کو مکمل نہیں سمجھتے۔

27.7 نظم ''موت کا گیت''

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگر گوں کر دیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں
ظلمتِ کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں
سگِ خوں خوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہتے ہیں
جاگ اٹھنے کو ہے اب خوں کا تلاطم دیکھو
ملک الموت کے چہرے کا تبسم دیکھو
جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں
ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں
قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں
دورِ ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روحِ انسان کو آزاد کیا جائے گا

نالۂ بے اثر اللہ کے بندوں کے لیے
صلۂ دار و رسن حق کے رسولوں کے لیے
قصرِ شدّاد کے دربند ہیں بھوکوں کے لیے
پھونک دو قصر کو گر کُن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دُنیا سے جو دُنیا ہے یہی
زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

27.7.1 نظم موت کا گیت کا تجزیہ

بیسویں صدی کی چوتھی و پانچویں دہائی میں باغیانہ نظمیں لکھی گئیں اور انقلاب کا رومانی تصور تھا جس میں کسی متبادل نظام حیات کی تجویز کے بغیر فرسودہ نظام کو تباہ کرنے کے لیے اکسایا جاتا تھا۔ نوجوان شاعر اس دنیا کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ ''موت کا گیت'' میں بھی اس نظام حیات کو منہدم کیا جذبہ جھلکتا ہے۔ مخدوم کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر انسان نے بہت استحصال کر لیا۔ ہر ظلم کو انسانی مقدر قرار دے کر انسان نے ایک کھیل جاری رکھا۔ وہ کہتے ہیں زمانے کے قلب میں شرارے بھر کر دو عالم تباہ کر دیں..... ظالم انسانوں نے لفظوں کے معنی بدل دیے ہیں۔ ظلمتِ کفر کا نام ایمان' خون خوار کتوں کا نام انسان اور دشمن جاں کو نگہبان قرار دیا گیا۔ اب یہ چلنے والا نہیں۔ اب عام آدمی جاگ اٹھا ہے۔ ایسے ظالموں کی تاک میں ملک الموت بیٹھا ہے۔ شاعر خبردار کرتا ہے کہ اب پتہ چلے گا کہ قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں' موت کا گرداب اور قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے اب انسان کی روح کو آزاد کیا جائے گا۔ وہ کہتا ہے اللہ کے بندوں پر درد بھری آواز کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے' جو حق کی بات کرتے ہیں انھیں دار و رسن ملتے ہیں۔ سرمایہ داروں نے بھوکوں کے لیے اپنے دروازے بند کر رکھے ہیں..... وہ ایسے محلوں کو پھونک دینے کے لیے کہتے ہیں۔ اگر یہی دنیا ہے جو 'کُن' (ہو جا) سے وجود میں آئی ہے یعنی خدا کی بنائی ہوئی دنیا یہی ہے تو ایسی دنیا کو ختم کر دیا جائے۔ وہ زلزلوں' بجلیوں اور آندھیوں سے کہتے ہیں کہ وہ اس کرہ ناپاک کو ختم کر دیں۔ لیکن بالکل آخری مصرعے میں مخدوم کہتے ہیں۔

کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

وہ چاہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام اور طاقت اور اقتدار کے ایسے مراکز ختم ہو جانے چاہئیں جہاں سے غریبوں پر ظلم روا رکھا گیا ہے۔ دنیا کو وہ معمور کرم کرنا چاہتے ہیں۔

اس نظم میں مخدوم نے اسلامی ثقافتی علامتیں استعمال کی ہیں۔ مور بیجاں اور سلیمان کا استعارہ' دو عالم' ظلمت کفر اور ایمان' ملک الموت' قبر کے پہلوؤں کی داب' قصر شدّاد' کُن کا تماشا اور جہنم..... اسلامی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان تراکیب کو مختلف معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس نظم میں مخدوم کا آہنگ اور لہجے کی لے بہت تیز ہے۔ ایک انقلابی کیفیت اور جوش ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. خانہ پُری کیجیے۔

ظلمت کفر کو..... نہیں کہتے ہیں
سگ خواں خوار کو..... نہیں کہتے ہیں
دشمن جاں کو..... نہیں کہتے ہیں
جاگ اٹھنے کو ہے اب خوں کا..... دیکھو
ملک الموت کے چہرے کا..... دیکھو

27.8 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے مخدوم محی الدین کی حیات' کارنامے اوران کی نظم نگاری کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

مخدوم کا پورا نام محمد مخدوم محی الدین خذری ہے۔وہ 1908ء میں قصبۂ اندول ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ مخدوم نے ایم۔اے تک تعلیم حاصل کی۔مخدوم نے ابتدا میں سخت جدوجہد کی۔مخدوم ترقی پسند مصنفین سے وابستہ اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔انھوں نے شاہی کے خلاف جدوجہد کی' تلنگانہ تحریک میں عملاً حصہ لیا۔انھوں نے سوویت یونین' چین' مشرقی یورپ کے ممالک اور آفریقی ممالک کا دورہ کیا۔مخدوم کا انتقال ۲۵' اگست 1969ء کو ہوا۔

سرخ سویرا' گل تر اور بساط رقص ان کے شعری مجموعے ہیں۔

مخدوم کی شاعری کی ابتدا 1923 میں ہوئی۔ان کی پہلی مطبوعہ نظم ''طور'' ہے۔ابتدا میں مخدوم نے عشقیہ و رومانی شاعری کی۔ان کی غنائی نظموں میں تلنگن' انتظار' ساگر کے کنارے' لمحہ رخصت' جوانی' وہ آتش کدہ اور پشیمانی اہم ہیں۔ان نظموں میں مخدوم کا محبوب تصوراتی نہیں بلکہ حقیقی محسوس ہوتا ہے۔یہ محبوب اردو شاعری کے روایتی محبوب سے مختلف ہے جو ستانے اور تڑپانے کی ادائیں جانتا ہے بلکہ مخدوم کا محبوب کم سن و معصوم ہے۔مخدوم نے اس دور کے رومانی مزاج سے ہٹ کر شاعری کی۔سرخ سویرا میں رومانی نظمیں بھی ہیں اور انقلابی بھی۔

گل تر میں بھی رومانی نظمیں ملتی ہیں جن میں چارہ گر' رقص' فاصلے' ہم دونوں' احساس کی رات وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔ان نظموں میں شاعر شک و شبہات کا اظہار کرتا ہے اور استفہامیہ لہجہ اختیار کرتا ہے۔

مخدوم کی پہلی سیاسی نظم ''جنگ'' ہے۔اس کے بعد انھوں نے دھواں اور 'اندھیرا' جیسی نظمیں لکھیں جن میں انھوں نے جنگ کے خلاف ابدی صدائے احتجاج بلند کیا تھا۔نظم ''جنگ آزادی'' نے مزدوروں اور محنت کشوں میں ایک انقلابی ترانے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔جن نظموں میں سماجی شعور واضح ہے وہ ہیں حویلی' مشرق' باغی اور تلنگانہ۔نظم مشرق میں وہ 'نیا آدم' کا تصور دیتے ہیں۔''زلف چلیپا'' سے انھوں نے راست خطابت کی بجائے استعاراتی زبان کا استعمال کیا۔''چاند تاروں کا بن''۔''قید''۔''سناٹا''۔''درہ موت''۔''ملاقات''۔''چپ نہ رہو'' اہم نظمیں ہیں۔مخدوم کو محنت و محبت کا شاعر کہا جاتا ہے۔

نظم ''اندھیرا'' میں اندھیرا سرمایہ دارانہ نظام کا ہے اور طلوع سحر اشتراکیت کے دور کا آغاز ہے۔''چاند تاروں کا بن'' ہندوستانی معاشرے کے تاریخی ارتقا کے تین ادوار کا علامتی اظہار ہے۔موت کا گیت میں فرسودہ نظام کو بھسم کر کے دنیا کو معمور کرنے کی خواہش ہے۔

27.9 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. مخدوم کی حیات اور کارنامے تحریر کیجیے۔
2. مخدوم کی عشقیہ و رومانی شاعری کا احاطہ کیجیے۔
3. مخدوم کی سماجی و انقلابی شاعری پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. نظم ''اندھیرا'' کا مرکزی خیال تحریر کیجیے۔
2. نظم ''چاند تاروں کا بن'' کی تشریح کیجیے۔
3. ''موت کا گیت'' کا خلاصہ لکھیے۔

27.10 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
افعی	=	سانپ	بن	=	جنگل	تشنگی	=	پیاس
تلچھٹیں	=	تل میں (نیچے) بچی ہوئی شئے	جوئے خوں	=	خون کی نہر	خارزار	=	کانٹوں بھرا میدان
خندقیں	=	گڑھے	خورشید	=	سورج	دارورسن	=	سولی اور رسی
درخشاں	=	چمکتا ہوا	دریوزہ	=	بھیک مانگنا، فقیری	دگرگوں	=	بُرا حال
دوش	=	کندھا	سگ	=	کتا	سوئے منزل	=	منزل کی طرف
ظلمت	=	اندھیرا	عزازیل	=	شیطان	فریادکناں	=	فریاد کرنے والے
قصر	=	محل	قلب گیتی	=	زمانے کا دل	کرہ	=	گولا، گول چیز
کاسۂ دُہر	=	دنیا کا پیالہ یا کٹورہ	کُن	=	ہوجا	گرداب	=	پانی کے چکر
کمیں گاہ	=	گھات کی جگہ (شکار کی تاک میں چھپ کر بیٹھنے)				مکر	=	عیاری۔دھوکا
ملک الموت	=	موت کا فرشتہ	نوحہ	=	ماتم کرنا، رونا پیٹنا	نالہ	=	رونا، دہائی

27.11 سفارش کردہ کتابیں

.1	داؤد اشرف	مخدوم ایک مطالعہ
.2	شاذ تمکنت	مخدوم محی الدین، حیات و کارنامے
.3	ظفر الحسن	عمر گذشتہ کی کتاب
.4	ظفر الحسن	دکن اداس ہے یارو
.5	صبا	مخدوم نمبر 1966
.6	نیا آدم	مخدوم نمبر 1970
.7	الیکسی سوخاچیف	ترجمہ محمد اسامہ فاورقی

اکائی 28 : اختر الایمان: حیات، نظم نگاری کی خصوصیات

ساخت

28.1 تمہید

28.2 اختر الایمان کے حالاتِ زندگی

28.3 اختر الایمان کی نظم نگاری

28.4 اختر الایمان کی نظمیں

28.4.1 ایک لڑکا

28.4.2 یادیں

28.4.3 سرِ راہ گزارے

28.5 خلاصہ

28.6 نمونہ امتحانی سوالات

28.7 فرہنگ

28.8 سفارش کردہ کتابیں

28.1 تمہید

اس اکائی میں اختر الایمان کے حالاتِ زندگی اور ان کی نظم نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اختر الایمان کا شمار اردو کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے آغاز اور عروج کے زمانہ میں ترقی پسند شاعروں سے ہٹ کر اپنی آواز بنائی۔ بظاہر وہ حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں سے قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی آواز ان کی اپنی آواز ہے۔ اس اکائی میں اختر الایمان کی زندگی اور ان کے فن پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان کی تین نظمیں بھی پیش کی گئی ہیں جن کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

28.2 اختر الایمان کے حالاتِ زندگی

اتر پردیش کے ضلع بجنور کا ایک موضع راؤ کھیڑی ہے۔ راؤ کھیڑی ابتدا سے مسلمان راجپوتوں کی بستی ہے۔ اختر الایمان کے بزرگ اپنے آپ کو راجپوت کہتے تھے۔ اختر الایمان کے دادا کا نام اقبال راؤ تھا۔ ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ اختر الایمان کے والد فتح محمد 12 جنوری 1880 کو راؤ کھیڑی میں پیدا ہوئے۔ یہ بڑی اچھی صلاحیتوں کے مالک اور ذہین آدمی تھے۔ قرآن شریف حفظ کیا تھا۔ عربی جانتے تھے، فارسی بھی پڑھی تھی، اردو اور ہندی میں خوش خط تھے۔ طب کی بھی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ اختر الایمان کا کہنا تھا کہ والد کے مزاج میں بے حد ضد تھی اور ان کے والدین میں ہمیشہ کسی نہ کسی باعث شکر رنجی، اختلاف اور لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ والد کا پیشہ امامت تھا۔ کہیں مستقل قیام نہ رہا، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جایا کرتے تھے۔ ان کی اولاد میں تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھے۔ اختر الایمان سب سے بڑے تھے۔

اختر الایمان جمعہ ۴ محرم الحرام 1334ھ م 12 نومبر 1915ء کو قلعہ پتھر گڑھ میں پیدا ہوئے۔ پتھر گڑھ ایک چھوٹا سا موضع ہے جو قصبہ نجیب آباد سے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر ہے اور نجیب آباد کا حصہ ہے۔ پتھر گڑھ اختر الایمان کا ننھیال ہے۔ اختر الایمان کا بچپن کا دور خانہ بدوشانہ رہا۔ امامت کے سلسلے میں ان کے والد اختر الایمان کو ساتھ لیے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جایا کرتے۔ کمباسی اور اس کے بعد اختر الایمان کو سگھ مدرسے میں شریک کیا گیا جو ایک یتیم خانہ تھا۔ اختر الایمان جگادھری میں بھی رہے۔ یہاں ان کے چچا اور چچی دونوں آئے اور انھیں اپنے ہمراہ دہلی لے گئے کہ پرورش کریں

گے لیکن بعد میں انھیں یتیم خانہ مؤید الاسلام میں داخل کر دیا گیا۔ یہ ایک اسکول بھی تھا۔ اختر الایمان کی ذہنی تربیت میں مؤید الاسلام کے اساتذہ کا بڑا حصہ رہا۔ اس کے بعد انہوں نے فتح پور سیکری مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں امتحان میں کامیابی کے بعد انہوں نے اینگلو عربک کالج کا رخ کیا۔ اس کالج کے طالب علم رہتے ہوئے اختر الایمان نے غیر تدریسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سکریٹری ہوئے۔

اینگلو تحریک کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد اختر الایمان یہیں سے ایم۔ اے کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی غیر تدریسی سرگرمیوں کے باعث پرنسپل ان سے خائف تھے انھیں وہاں داخلہ نہیں ملا۔ اسی زمانے میں ساغر نظامی کی خواہش پر اختر الایمان 1941ء میں ''ایشیا'' کی ادارت کے سلسلے میں میرٹھ چلے گئے۔ انھوں نے میرٹھ یونیورسٹی میں ایم۔ اے (فارسی) میں داخلہ بھی لے لیا لیکن یہاں وہ زیادہ دن نہیں رہ سکے اور چند ماہ بعد دہلی واپس ہو گئے۔ دہلی میں ایک مہینے کے لیے سپلائی ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی اور پھر دہلی ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہو گئے لیکن یہ ملازمت بھی جلد چھوٹ گئی۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے قطع تعلق کے بعد اختر الایمان علی گڑھ چلے آئے۔ رشید احمد صدیقی اور شاہد احمد دہلوی کے تعاون سے ایم۔ اے اردو میں داخلہ لیا۔ وہ پہلے سال امتیاز سے کامیاب بھی ہوئے لیکن کہیں سے مستقل آمدنی نہیں تھی اس لیے تعلیم کا سلسلہ ترک کرنا پڑا۔

جولائی 1944ء میں اختر الایمان نے حیدر آباد کانفرنس میں شرکت کی اور حیدر آباد سے پونے روانہ ہوئے اس دوران اختر الایمان کا شعری مجموعہ ''گرداب'' شائع ہو چکا تھا اور وہ ادبی حلقوں میں معروف تھے۔ پونے میں شالیمار اسٹوڈیو میں اختر الایمان کی ڈبلیو۔ زیڈ احمد سے ملاقات ہوئی۔ ان ہی کے ایما پر اختر الایمان نے فلمی دنیا سے وابستگی اختیار کر لی اور کئی کہانیاں لکھیں۔ 3 مئی 1947ء کو اختر الایمان کا سلطانہ منصور سے صرف نکاح ہوا تھا لیکن جب چند ماہ بعد فسادات شروع ہوئے تو سلطانہ منصور کے رشتہ دار اور بہنیں وغیرہ پاکستان چلے گئے اور سلطانہ بمبئی آ گئیں۔ گویا یہی ان کی وداعی کی تقریب تھی۔

اگست یا ستمبر 1949 کی بات ہے کہ انڈر گراونڈ کمیونسٹوں کے لیے جلسوں کا اہتمام کرنے کے الزام میں بمبئی میں اختر الایمان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اس وقت ان کی لڑکی شہلا چھ مہینے کی تھی۔ انھیں لگ بھگ ایک ماہ تک آرتھر روڈ جیل میں رکھا گیا۔

ملک کا شاید ہی کوئی حصہ ہو جہاں اختر الایمان نہ گئے ہوں۔ مشاعروں، سمیناروں اور فلم کی مصروفیات کے سلسلے میں وہ ملک کے طول و عرض میں جا چکے ہیں۔ وہ اردو کے ایسے شاعروں میں ہیں جنھیں دنیا کے کئی علاقوں کے سفر کا موقع ملا۔ چنانچہ پہلی بار جون 1976ء میں بیروت میں افرو ایشائی کانفرنس کے سلسلے میں وہ ملک سے باہر گئے، سجاد ظہیر اور ملک راج آنند ان کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر انھوں نے دمشق اور ماسکو کا سفر بھی کیا۔ لندن، پیرس اور قاہرہ ہوتے ہوئے ہندوستان واپسی آئے۔ 1970ء میں فلم ''چاندی سونا'' کے سلسلے میں ماریشس گئے انہوں نے اس فلم کے مکالمے لکھے تھے۔ فلم ''سفاری'' کے سلسلے میں انھیں کینیا، تنزانیہ، یوگنڈا اور نیروبی جانا پڑا۔ فیروز خاں کی فلم ''اپرادھ'' کی شوٹنگ جرمنی میں ہوئی مکالمہ نگار کی حیثیت سے وہ بھی جرمنی گئے اور پھر کام ختم ہونے پر برلن، جینوا اور روم ہوتے ہوئے ہندوستان واپس ہوئے۔ 1980ء میں مشاعروں کے سلسلے میں ان کا نیویارک، لاس اینجلس، سان فرانسسکو، ڈزنی لینڈ اور شکاگو جانا ہوا۔ واپس ہوتے ہوئے انہوں نے فرانکفورڈ، قاہرہ، دوبئی اور کراچی میں تھوڑے تھوڑے دنوں کے لیے قیام کیا۔ 1983ء میں ان کو پھر کینیڈا، مانٹریال، ٹورنٹو، شکاگو، نیویارک اور واپسی میں پاکستان جانے کا موقع ملا۔ 1985ء میں اپنے 70 سالہ جشن میں شرکت کے لیے وہ ٹورنٹو گئے۔ اس وقت ان کی بیوی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ واپسی میں انھوں نے یورپ اور ایشیا کے کئی ممالک کی سیر کی۔ اسی سال اردو اکادمی دہلی نے انھیں بہادر شاہ ظفر کل ہند ایوارڈ دیا۔

جنوری 1986ء میں انھیں اچانک دل کی شکایت شروع ہوئی۔ لگ بھگ تین ماہ وہ بمبئی کے مختلف ہسپتالوں میں زیر علاج رہے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ برج کینڈی ہاسپٹل سے یہ کہہ کر رخصت کرایا گیا کہ یہاں ان کا علاج ممکن نہیں، انھیں باہر جانا ہوگا۔ چنانچہ بوسٹن سے ربط پیدا کیا گیا اور وہ 27 اپریل 1986ء کو اپنی اہلیہ کے ہمراہ بوسٹن روانہ ہوئے۔ بوسٹن میں ان کے پانچ بائی پاس ہوئے اور ایک Value بدلا گیا۔ آپریشن اور مکمل علاج کے بعد اختر الایمان بمبئی واپس ہوئے۔

اختر الایمان نے اس علالت سے صحت یابی کے بعد اپنی بیشتر مصروفیات ترک کر دی تھیں۔ وہ شعر بھی کم کہنے لگے تھے اور فلمی دنیا کے کاموں کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا۔ کوئی ضروری کام ہو تو وہ گھر پر ہی کرنے لگے تھے۔ اسٹوڈیو وغیرہ جانا برائے نام ہو گیا تھا لیکن ان کی صحت جو بگڑی تھی مزید بگڑنے لگی تھی، چند ایک سال یہی صورت رہی، سب تدبیریں الٹی ہونے لگیں، دوا نے کچھ کام نہ کیا اور بیماری دل نے اپنا کام تمام کر دیا۔ 9 مارچ 1996ء کو اختر الایمان نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا اور 10 مارچ 1996 کو دن میں باندرہ قبرستان (جنرل) میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

اختر الایمان نے بمبئی میں 50 سالہ قیام کے دوران تقریباً 100 فلموں کے منظر نامے اور مکالمے لکھے جن میں نغمہ، رفتار، زندگی اور طوفان، مغل اعظم، قانون، وقت، داغ، آدمی، مجرم، شبنم، ضمیر، آدمی اور انسان اور اپرادھ بے حد مشہور ہوئے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''گرداب'' ہے جو 1943ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سب رنگ (1946ء) تاریک سیارہ (1952ء) آبِ جو (1959ء) یادیں (1960ء) بنتِ لمحات (1969ء) نیا آہنگ (1977ء) سروساماں (1983ء) زمین زمین (1990ء) اور ''زمستانِ سرد مہری'' ان کی وفات کے بعد 1997ء میں شائع ہوا۔

اختر الایمان کو کئی اعلیٰ اور پُر وقار ایوارڈ اور اعزازات بھی ملے۔ 1960ء میں انھیں ''یادیں'' پر ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملا۔ ''بنتِ لمحات'' پر اتر پردیش اردو اکیڈیمی اور میرا اکیڈیمی نے انعامات سے نوازا۔ ''نیا آہنگ'' پر مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی نے انعام دیا۔ ''سروساماں'' پر حکومت مدھیہ پردیش نے ''اقبال سمان'' سے نوازا۔ اور اسی مجموعہ پر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی اور اردو اکیڈیمی دہلی نے بھی اعزازات دیے۔ اختر الایمان کی خودنوشت ''اس آباد خرابہ میں'' بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اختر الایمان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھیے۔
2. اختر الایمان نے فلمی زندگی کیسے اختیار کی؟
3. اختر الایمان کی علالت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

28.3 اختر الایمان کی نظم نگاری

ترقی پسند تحریک اردو شعر و ادب میں تاریخی حیثیت رکھتی ہے اس تحریک کی اردو شعر و ادب کو دین بھی ہے، نثر اور شاعری دونوں میں لیکن خاص طور پر شاعری میں۔ فیض، مخدوم، سردار جعفری، کیفی ساحر، جانثار اختر اور مجروح جیسے شاعروں کے باعث ترقی پسند تحریک کا سر بلند ہے۔ ترقی پسند تحریک کے محاذی حلقہ ارباب ذوق تھا۔ حلقہ ارباب ذوق نے بھی اردو ادب کو روشنی دی ہے۔ اس سلسلے میں راشد اور میرا جی کے نام کافی ہیں..... لیکن ایسے شاعر بھی ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک یا حلقہ ارباب ذوق سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی ہر دو سے تعلق رکھا اور اپنی شاعرانہ شخصیت کی تشکیل میں لگے رہے اور ہمارے نامور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اختر الایمان ایک ایسے ہی شاعر ہیں جنھیں اردو شاعری کی تیسری آواز کہا گیا ہے۔ اختر الایمان کی انفرادیت اس میں ہے کہ انھوں نے اشتراکی نقطہ نظر سے دلچسپی رکھنے کے باوصف اشتراکیت کا سطحی پروپگنڈہ نہیں کیا۔ اشتراکیت کے تعلق سے اختر الایمان نکھرا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں وہ جذباتی رویہ نہیں جو اشتراکیت کے بارے میں اور جدت پرستی کے شوق میں بعض شاعروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اختر الایمان نے مغربی زبانوں کی شاعری کے اثرات بھی قبول کیے۔ آزاد اور معریٰ نظم نگاری بھی کی۔ ہیئت کے بہت سے تجربوں کو آزمایا لیکن انھوں نے خود کو ادبی گروہ بندی سے دور رکھا۔

اختر الایمان نے زمانے کے کئی نشیب و فراز دیکھے، بے رخی کا سامنا کیا اور زندگی کے فریب کھائے لیکن ان کے یہاں زندگی اور زمانے کے تعلق سے بیزاری اور برگشتگی نہیں ملتی۔ زندگی اور زمانے کے منفی رویے کے باوجود ان کو زندگی اور زمانے سے پیار تھا۔ اسی کے ساتھ فکر کی سنجیدگی اور خاص طور پر ارتکاز فکر نے ان کے کلام میں گہرائی پیدا کر دی ہے۔ یوں ان کا کلام غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اختر الایمان کا زاویہ فکر بھی جداگانہ ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں احتیاط اور اچھوتے اسلوب نے ان کی شاعری کو مجموعی طور پر اور ان کی اشاریت کو بالتخصیص ندرت اور بانکپن کا حاصل بنا دیا ہے۔ جیسا کہ خود انھوں نے اپنے مجموعہ کلام ''یادیں'' کے ''پیش لفظ'' میں لکھا ہے ان کی ''نظموں کا بیشتر حصہ علامتی شاعری پر مشتمل ہے۔ بشمول میرا جی اور راشد، اردو کے کسی اور شاعر کے کلام کا اس قدر حصہ اشاریتی نہیں جس قدر کہ اختر الایمان کی شاعری کا ہے۔ اختر الایمان کے اشارات صاف ستھرے ہیں۔ ادبی ورثہ اور شعری روایات سے کما حقہ آگہی اور اسی کے ساتھ عصری شعری تقاضوں، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات، سائنسی ترقیات اور ذہنی فکری میلانات میں تبدیلی اور ارتقا کے صحیح شعور کے سبب ان کی اشاریت گنجلک اور پیچیدہ نہیں، بلیغ، معنی خیز اور ساتھ ہی دل آویز ہو جاتی ہے۔ یہی اشاریتی رویہ ان کی شاعری کو حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں سے ممیز کرتا ہے۔ اختر الایمان کی اشاریتی شاعری کے ذیل میں یہاں سب سے پہلے ان کی نظم ''قلوپطرہ'' کا

ذکر کیا جائے گا اس لیے بھی کہ خود شاعر نے اس نظم کے اشارات کی توضیح کی ہے۔ اس طرح نہ صرف اس نظم کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے بلکہ آگے چل کر شاعر کے اشاریتی اسلوب کو سمجھنا بھی سہل ہو جاتا ہے۔ قلوپطرہ کی رعایت سے اس نظم میں اور کئی نام پرویز اور انطونی وغیرہ اشارات کے بطور استعمال ہوئے ہیں۔ اختر الایمان 'ان کی وضاحت کرتے ہیں:

> ''مثال کے طور پر میری نظم ''قلوپطرہ''۔ اس نظم کا پس منظر' دوسری جنگِ عظیم ہے۔ لفظ ''قلوپطرہ'' کو میں نے اس کی تاریخی پس منظر میں استعمال کیا ہے اور نہ اس کے اپنے معنوں میں۔ قلوپطرہ کے نام سے جو اخلاقی پستی وابستہ ہے' یہاں اس تصور کا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ جنگ کے نتائج میں ایک قحبگی کی افزائش بھی ہے۔ قلوپطرہ کا اشارہ استعمال کر کے اس قحبگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نام کے ساتھ نظم میں اور کئی نام ہیں جیسے پرویز' انطونی۔ یہ بھی علامیہ ہی کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔
>
> (''یادیں'' 1961 ص12)

اختر الایمان کی شاعری کی اہم خصوصیت اس کی اشاریت ہے۔ ان کی کئی نظموں میں معنویت سے بھرپور اشارات اور کہیں کہیں اشاریتی فضا بھی ملتی ہے۔ ''پرانی فصیل'' بھی ان کی ایسی ہی نظم ہے جس میں انھوں نے اشاریتی پیرایہ میں اپنے ماضی کو روشن کیا ہے۔ یہاں اشاریت کی بہتات بھی ہے۔ رخنوں' جھینگر' چوہے' شبنم' بھٹکی ہوئی روحیں' انسان کے پلے اور افعی جیسے اشارات سے نظم وقیع ہو جاتی ہے۔ ماضی اور ماضی کی تہذیب' اس تہذیب کے ازکار رفتہ گوشے' گھناونے اور مذموم رخ جو گل سڑ کر معاشرہ میں گندگی پھیلا رہے ہیں ماضی جو بے روح تھا متعفن لاش کی طرح' لیکن پھر بھی زندگی کا مدعی تھا۔ اس ماضی اور اس کی تہذیب کو اختر الایمان نے ''پرانی فصیل'' کے اشارے سے تعبیر کیا ہے۔

اختر الایمان کی زیادہ تر منظومات مختصر ہیں۔ اس اختصار نے ان کے کلام میں اشاریت کو نکھار دیا ہے۔ اشاریت ارتکازِ فکر سے پیدا ہوتی ہے اور ارتکازِ فکر ہی سے نظمیں مختصر اور ایسی مختصر نظمیں ہی کامیاب ہوتی ہیں۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اختر الایمان کی شاعری کا قابل لحاظ حصہ یادوں پر مشتمل ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے کا نام ہی ''یادیں'' ہے۔ یہ یادیں انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ ان کا تعلق آپ بیتی سے بھی ہے اور پر بیتی سے بھی۔ یہ یادیں خوشگوار بھی ہیں اور ناخوشگوار بھی۔ غالباً یہ حال سے بے اطمینانی ہے کہ شاعر یادوں کی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔ یادیں' خود کلامی کے انداز میں اور اشاریت کے سہارے دائروں اور دائروں میں پھیلتیں' ایک وسیع کینوس کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ ''ایک لڑکا'' ایک ہی ایسی خوبصورت نظم ہے۔ ''کل کی بات''۔ ''ریت کے محل'' اور مسجد بھی اسی قبیل کے منظومات ہیں۔ ''مسجد'' کا موضوع موجودہ دور میں کسی بھی مذہب سے اس کے پیروؤں کی بے نیازی' مذہبی افراد کی بے راہ روی اور عصری قدریں ہے۔ اس نظم میں تین کردار' تین اشارات ہیں۔ مسجد مذہب کے لیے اشارہ ہے۔ شاعر نے مسجد کی زبوں حالی اور شکستگی کا ذکر کرتے ہوئے آج کے دور میں مذہب کی حالت کو اجاگر کیا ہے۔ رعشہ زدہ ہاتھ مذہب کے اشارے کے طور پر استعمال ہوا ہے جو عصری مسائل کو اپنی گرفت میں لینے اور ان پر قابو پانے کی اہلیت نہیں رکھتا اور ندی اشارہ ہے نئی قدروں کے لیے۔ ان تینوں اشارات کی کشمکش نے نظم کے بہاؤ کو تیز تر کر دیا ہے اور نظم معنوی طور پر تہہ دار ہو گئی ہے۔ اختر الایمان نے ایک اور نظم ''باز آمد'' میں بھی ندی کو بطور اشارہ استعمال کیا ہے۔ اس نظم میں برگد کا گھنا درخت' کپاس کوٹتی ہوئی عورتیں اور رمضان' قصائی وغیرہ بھی اچھے اشارات ہیں۔ ''تنہائی'' کا موضوع بظاہر شخصی ہے لیکن اختر الایمان نے اپنے شخصی تجربات کو بھی آفاقی حیثیت دے دی ہے۔ اس نظم میں ''ببول'' کا اشارہ شاعر کی ذات کی طرف ہے۔ ''نئی صبح بھی اشاریتی زاویے سے ایک اہم نظم ہے۔ ماضی اور حال' روایت اور بغاوت کی کشمکش' مٹتی ہوئی قدریں اور ابھرتا ہوا نیا معاشرہ' اس نظم کا موضوع ہے۔ کالا ساگر' رات' پرانے دیے' سرخ زبان کی نازک لو' ایک کہانی اور سورج کا نکلنا جیسے اشارات نظم کی معنویت کو گہرا کر دیتے ہیں۔ اس نظم کی ایک خوبی اس کا صوتی آہنگ ہے اور معنوی تسلسل بھی جو اشارات کے مفہوم کی وضاحت میں اعانت کرتے ہیں۔ شاعر ان اشارات کو یوں ابھارتا ہے کہ یہ نظم نئے دور کی نوید بن جاتی ہے وہ نیا دور جب کہ بستی جاگے' غم مٹ جائے۔ یہ مصرعے ملاحظہ ہوں:

کالے ساگر کی موجوں میں ڈوب گئیں دھندلی آشائیں
جلنے دو یہ دیے پرانے' خود ہی ٹھنڈے ہو جائیں گے

سرخ زباں کی لو پر جاگ رہی ہے ایک کہانی
ٹوٹے پھوٹے جام پڑے ہیں، سونی سونی ہے کچھ محفل
دھوپ سی ڈھل کر بیت گئی ہے ساقی کی مجبور جوانی
کیا جانے، کب سورج نکلے، بستی جاگے، غم مٹ جائیں

اور کتنی منظومات کا ذکر کیا جائے اختر الایمان کی شاعری تو اشاریت ہی سے عبارت ہے۔ اشارات کے استعمال میں ان کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔

اردو میں اکثر شاعروں نے اپنی شعر گوئی کی ابتدا غزل سے کی اور رومانیت سے۔ اختر الایمان نے ہر چند کہ غزلیں نہیں کہی ہیں لیکن ان کے ہاں کئی غزل رنگ اشعار مل جائیں گے اور تغزل تو ان کی کئی نظموں میں ہے ہی۔ لیکن ابتدائی دور کی شاعری پر رومانی رنگ غالب ہے۔ تاہم یہ رومانیت جوش اور اختر شیرانی کی طرح نہیں بلکہ اس میں قدرے افسردگی اور حزنیہ کیفیت پائی جاتی ہے اور تھوڑی سی قنوطیت بھی۔ یہ دارصل ردِعمل ہے اختر الایمان کی ابتدائی زندگی کا۔ انھوں نے بچپن اور نوجوانی کا زمانہ ناداری، بے زری، نا آسودگی اور بے یار و مددگاری کے ساتھ گزارا۔ بچپن میں باپ کے ساتھ گاؤں گاؤں پھرتے رہے تو جوانی میں ایک طرح ملازمت کی تلاش میں ادھر ادھر۔ اور یہ حالت پونے میں فلمی دنیا سے وابستگی تک برقرار رہتی ہے۔ اس کی جھلکیاں اختر الایمان کے ابتدائی دور کی منظومات ہی میں نہیں، آگے چل کر ان کی شاعری میں بھی مل جاتی ہیں۔ ''نقش پا''۔ ''دور کی آواز''۔ ''ایک یاد''۔ ''جواری تاریک سیارہ'' اور ''خاک و خوں'' وغیرہ ان کی ایسی ہی منظومات ہیں۔ ان کی نظم ''جمود'' کا مصرعہ ہے۔

تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں

یا ''ایک یاد'' کا یہ مصرعہ ع کسی ڈھلکے ہوئے آنچل کا سہارا بھی نہیں

اور اسی سلسلے میں نظم ''جواری'' کا آخری بند ہے۔

ہم تو اپنی سی کر ہارے، کوئی بھی تعمیر نہ ٹوٹی
سب ہی خواری، سب ہی لیٹرے، کون کسی سے بازی جیتے
بیت گئی ہے جیسی تیسی، باقی چاہے جیسی بیتے
وہم و جنوں کی، رنگ و فسوں کی پاؤں سے زنجیر نہ ٹوٹی

اس دھندلی، دھندلی، مدھم مدھم، رومانیت سے قطع نظر اختر الایمان کے یہاں ایک درد و غم کی کیفیت، ایک اداسی، اپنی ذات میں سمٹ جانے کا انداز اور ایک گومگو کی کیفیت ضروری ملتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف اختر الایمان کی ذات کی آئینہ داری نہیں، ان کی اپنی ہی مایوسی نہیں، اس میں ان کے عہد کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دیتی ہے۔ آزادی سے قبل ہو کہ بعد ہر طرف ایک اداسی ہے۔ آزادی سے قبل یہ توقع تھی کہ اب جو بھی رنج و غم اور مصائب و آلام ہوں، آزادی ملنے پر ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، ملک اقتصادی طور پر بہتر ہوگا۔ ہر طرف مسرت خوشی اور اطمینان کی فضا ہوگی لیکن آزادی کے بعد کچھ نہیں ہوا۔ ہم آزاد ہو گئے لیکن مسرت، خوشی اور اطمینان سے وہی کوسوں دور۔ خاص طور پر متوسط اور نچلے طبقات کے مصائب میں کوئی کمی نہ آئی ۔ ''پرانی فصیل'' کے یہ اشعار:

یہاں سرگوشیاں کرتی ہے ویرانی سے ویرانی
فسردہ شمع امید و تمنا لو نہیں دیتی
یہاں کی تیرہ بختی پر کوئی رونے نہیں آتا
یہاں جو چیز ہے ساکت کوئی کروٹ نہیں لیتی

اس سلسلے میں ''تاریک سیارہ'' کا خاص طور پر ذکر ہونا چاہیے۔ دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں تحریر کردہ یہ نظم اخر الایمان کی اہم ترین نظموں

میں شمار ہوتی ہے۔ایک حسرت ناک اور کرب انگیز فضا ہے تلخیاں افزوں ہوتی جارہی ہیں' حالات ناگفتہ بہہ ہیں۔خرابیوں نے ڈیرہ جمالیا ہے اور رات ہی نہیں دن بھی سیاسی اوڑھے ہوئے ہے۔گویا یہ دنیا تاریک سیارے کے حصار میں ہے۔اداسی' مایوسی اور افسردگی کے باوجود''تاریک سیارہ'' ایسی نظم ہے جو اختر الایمان کی شاعری پر ان اعتراضات کو رد کردیتی ہے کہ وہ صرف اظہار ذات تک محدود ہے۔زندگی اور زمانہ سے بیگانہ کہ حالات کے سرد و گرم سے علاقہ نہیں رکھتی۔اختر الایمان کے پاس ایسی کئی نظمیں مل جائیں گی جن میں شاعر کی عصری حسیت اور اطراف و اکناف سے اس کے تعلق خاطر کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔نقطہ نظر اور زاویہ فکر بدلا ہوا' اختر الایمان نے ترقی پسندوں کی طرح نہ سہی زمین اور زمانے سے خود کو مربوط ضرور رکھا۔تقسیم ہند کے موضوع پر اردو میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا' افسانے' ناول' ڈرامے' مضامین' نظمیں' غزلیں وغیرہ وغیرہ۔اختر الایمان نے نظموں میں بھی لیکن خاص طور پر اپنی نظم''کل کی بات'' میں تقسیم ہند اور فسادات کا نقشہ کھینچتے ہوئے جس طنز بلکہ زہرناکی سے کام لیا ہے وہ صرف انہی کا حصہ ہے۔نظم کے آخری مصرعے:

یک بیک شور ہوا' ملک نیا ملک بنا
اور اک آن میں محفل ہوئی درہم برہم
آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ زمیں لال ہے سب
تقویت ذہن نے دی' ٹھہرو! نہیں خون نہیں
پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوکی ہوگی!

یہ نظم تقسیم ہند پر تبصرہ نہیں ایک انسان دوست کا احتجاج ہے۔

اختر الایمان کی شاعری انسان اور انسان دوستی کی شاعری ہے۔اختر الایمان نے اپنی شاعری کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے کسی فلسفہ' ازم یا تحریک کا پرچار نہیں کیا۔انسان دوستی ان کی شاعری کا ایک ایسا وصف ہے جو انھیں اپنے ہمعصروں ہی میں نہیں اردو شاعری میں بھی ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔''خاک و خوں' بھی ایسی ہی ایک نظم ہے جس میں مایوسی اور بے اطمینانی کی فضا تو ہے لیکن شاعر نے بتدریج اس فضا پر قابو پالیا ہے۔اب وہ ناامیدی اور مایوسی کے حصار سے نکل کر رجائیت کی طرف سفر کرتا ہے۔اس نظم کا آخری مصرعہ تو بڑے معرکہ کا ہے۔اختر الایمان کی رجائیت اور ان کی انسان دوستی کا مظہر۔

آپ ہوں' میں نہیں' انسان سے مایوس ابھی

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اختر الایمان کی شاعری کے پس منظر کے بارے میں لکھیے۔
2. اختر الایمان کی چند نظموں کے نام لکھیے جن میں انھوں نے اشارات کا استعمال کیا ہے۔
3. اختر الایمان کے کلام میں ناامیدی اور مایوسی کا سبب کیا ہے؟

28.4 اختر الایمان کی نظمیں

اختر الایمان نے غزل کے عنوان سے تو کچھ نہیں کہا۔لیکن ان کے کلام میں غزل رنگ اشعار کئی مل جائیں گے۔تغزل تو ان کی بے شمار نظموں میں ملتا ہے۔مجموعی طور پر اختر الایمان کو نظم کا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ہم نے آپ کو اختر الایمان کی نظم نگاری کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے۔آیئے اب ہم اختر الایمان کی تین نظموں''ایک لڑکا''۔''یادیں'' اور''سرراہ گزارے'' کا تجزیاتی مطالعہ کریں گے۔

28.4.1 ایک لڑکا

دیار شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کے مینڈوں پہ
کبھی جھیلوں کے پانی میں' کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم جھٹپٹے کے وقت' راتوں کے اندھیروں میں
کبھی میلوں میں' ناٹک ٹولیوں میں' اُن کے ڈیرے میں

تعاقب میں کبھی گم تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
ہوا میں تیرتا ' خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
مجھے اک لڑکا آوارہ منش ' آزاد ' سیلانی
نظر آتا ہے' یوں لگتا ہے جیسے یہ بلائے جاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں' یہ سائے کی طرح میرا
یہ مجھ سے پوچھتا ہے' اختر الایمان تم ہی ہو
مجھے اقرار ہے' اس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
مجھے اقرار ہے ' یہ خیمۂ افلاک کا سایا
فضاؤں میں سنوارا اک حدِ فاصل مقرر کی
مری تخلیق کی مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
ہوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کردی ہیں
اندھیرے کو اُجالے سے جُدا کرتا ہے' میں خود کو
اسی نے خسروی دی ہے لٹیموں کو' مجھے نکبت
تونگر ہرزہ کاروں کو کیا ' دریوزہ گر مجھ کو
یہ لڑکا پوچھتا ہے ' اختر الایمان تم ہی ہو ؟
جز اک ذہن رسا کچھ بھی نہیں' پھر بھی مگر مجھ کو
عناصر منتشر ہوجانے' نبضیں ڈوب جانے تک
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
وہ خامہ سوزی' شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہے
کبھی جب سوچتا ہوں' اپنے بارے میں' تو کہتا ہوں
غرض گرداں ہوں بادِ صبح گاہی کی طرح ' لیکن
یہ لڑکا پوچھتا ہے ' اختر الایمان تم ہی ہو ؟
وہ آشفتہ مزاج ' اندوہ پرور' اضطراب آسا
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں' وہ شعلہ مر چکا جس نے
یہ لڑکا مسکراتا ہے' یہ آہستہ سے کہتا ہے

کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
کبھی پیچاں بگولا ساں ' کبھی جیوں چشم' خوں بستہ
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا مڑتا
مجھے اک لڑکا ' جیسے تند چشموں کا رواں پانی
مرا ہم زاد ہے ہر گام پر ہر موڑ پر جولان
تعاقب کررہا ہے ' جیسے میں مفرور ملزم ہوں
خدائے عزوجل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
کہ جیسے بسترِ کمخواب ہو ' دیبا و مخمل ہو
اسی کی بخششیں ہیں' اُس نے سورج چاند تاروں کو
چٹانیں چیر کر دریا نکالے 'خاکِ اسفل سے
سمندر موتیوں مونگوں سے' کانیں لعل و گوہر سے
وہ حاکمِ قادرِ مطلق ہے ' یکتا اور دانا ہے
اگر پہچانتا ہوں ' اس کی محنت اور سخاوت ہے
اسی نے یا وہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے' میرے قبضے میں
خروشِ عمر کے اتمام تک اک بوجھ اٹھانا ہے
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب ' کچھ بھی گانا ہے
کبھی اپنا ہی نغمہ اُن کا کہہ کر مسکرانا ہے
اُسے اک کھوٹے سکے کی طرح سب کو دکھانا ہے
کہ تو اک آبلہ ہے' جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
سحر کی آرزو میں دامنِ شب تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے جب ' تو میں جھلا کے کہتا ہوں
جسے تم پوچھتے رہتے ہو' کب کا مر چکا ظالم
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
کبھی چاہا تھا ' اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ کذب و افترا ہے' جھوٹ ہے' دیکھو میں زندہ ہوں

''ایک لڑکا'' اختر الایمان کی اہم ترین ہی نہیں مقبول ترین نظموں میں بھی ہے۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ اختر الایمان کی شاعری میں یادوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کی شاعری یادوں کی شاعری ہے۔ خاص طور پر ان کے بچپن' لڑکپن اور کسی حد تک نوجوانی کی یادیں..... یہ نظم بچپن کی یادوں سے مہک رہی ہے۔ اونچے ٹیلے ہیں۔ آموں کے باغ' کھیتوں کی منڈیریں' جھیلوں کا پانی' بستی کی گلیاں جھٹپٹے کا وقت' راتوں کے اندھیرے' برہنہ

پاؤں، ننگی ریت، یخ بستہ ہوائیں اور ان میں ہواؤں میں تیرتا، خوابوں میں بادلوں کی طرح اڑتا، پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا ایک لڑکا، جو اور کوئی نہیں، اختر الایمان کا ہمزاد ہے، اختر الایمان ہے۔ یہ تجزیہ کسی اور کا نہیں۔ خود اختر الایمان نے ''یادیں'' کے دیباچہ میں لکھا ہے:

''مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہا ہے اور یہ واقعہ اس نظم کا محرک ہے ہم ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دوسرے گاؤں میں جا رہے تھے۔ اس وقت سامان بیل گاڑی میں لادا جا رہا تھا اور میں اس گاڑی کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پر کرب اور بے بسی تھی۔ اس لیے کہ میں اس گاؤں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں بڑے بڑے باغ تھے، باغوں میں کھلیان پڑے تھے، کوئلیں کوکتی رہتی تھیں۔ وہاں جوہڑ تھے۔ جوہڑوں میں نیلوفر اور کنول تھے، وہاں کھیتوں میں ہرنیوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی نظر آتی ہیں وہاں وہ سب تھا جو مجھے ذہنی طور پر پسند ہے۔ مگر وہ معصوم لڑکا اس گاڑی کو روک نہ سکا۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ کر آگے چلا گیا مگر وہ لڑکا وہیں رہ گیا۔''

لڑکے کو آوارہ منش آزاد، سیلانی اور تند چشموں کے رواں پانی سے تشبیہ دے کر وہ نئی قوتوں کی اہمیت، ان کی بھرپور زندگی اور ابھرتی طاقتوں کی سمت اشارہ کرتے ہیں اور جب یہ لڑکا ہمزاد ہے تو دور ہو کر بھی ساتھ رہے گا ہی۔ اختر الایمان یہاں فطرت نگاری کرتے ہوئے خدائے عزوجل کی نعمتوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اپنے ایقان و ایمان کا اظہار بھی کہ وہ ذاتِ واحد ہی ہے جس نے یہ زمین و آسمان بنائے، انسان کو جہاں کی پاسبانی دی، سمندر کو موتیوں، مونگوں سے، کانوں کو لعل و گہر سے اور ہواؤں کو مست کن، خوشبوؤں سے معمور کر دیا۔ نظم کے اس موڑ پر اختر الایمان نہایت خوبی سے دنیا کی دگر گوں حالت، افراتفری، خستگی، فریب اور مکاری سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ یہ موڑ اس نظم کا اہم موڑ ہے کہ نظم ذات کے حصار سے نکل کر قومی بلکہ عالمی منظر نامہ کا حصہ بن جاتی ہے۔ سارا انتشار و اختلال سامنے آ جاتا ہے اور یہ لڑکا اب صرف ایک لڑکا اور اختر الایمان نہیں، انسان کی معصومیت، سادہ دلی، آزادیٔ فکر، سچائی اور یوں ساری انسانیت کے ضمیر کا اشارہ بن جاتا ہے۔ یہاں لڑکے کے ساتھ ایک اور کردار بھی ہے شاعر کا کردار۔ جو ہمارے تہذیبی ورثے کی نمائندگی کرتا ہے۔ جدلیاتی کشمکش اور زندگی میں پائے جانے والے تضادات کو پیش کرتا ہے۔ اس نظم کے ذریعہ اختر الایمان نے سرمایہ دارانہ نظام کو شدید طنز کا نشانہ بنایا ہے لہجہ کی شدت اور تلخی نے نظم کی تاثیر کو کہیں افزوں کر دیا ہے۔ یہ مصرعے کتنے جیتے جاگتے ہیں:

اُسی نے خسروی دی ہے لیئموں کو، مجھے نکبت
اسی نے یا وہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تو نگر ہرزہ گویوں کو کیا، دریوزہ گر مجھ کو

یہ معاشرہ ہی کا نہیں ساری انسانیت کا سانحہ ہے کہ استحصال پسندوں، جابروں، قاہروں اور ظالموں کے ہاتھ میں معیشت ہے اور دانشوروں اور انسان دوستوں کے پاس جز اک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں۔ نظم یہاں معنویت سے بھرپور ہو جاتی ہے۔ دلکش بھی۔ یزدانی اور اہرمنی قوتوں کا موازنہ ہوتا ہے، آشفتہ مزاج، اندوہ پرور اور اضطراب آساوہ لڑکا، ہمزاد، انسانیت کا ضمیر، لاکھ دبانے اور ختم کرنے کی سعی کے باوجود اپنے وجود کو منواتا ہے کہ وہ زندہ ہے گویا انسانی ضمیر کبھی نہیں مر سکتا۔ انسانیت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ''ایک لڑکا'' کا مجموعی خیال کیا ہے؟
2. ایک لڑکا کون ہے؟
3. اس نظم کے آخری حصے میں شاعر نے کن حالات کا ذکر کیا ہے؟

28.4.2 یادیں

وہ چاہِ شب سے نکلا پچھلے پہر بیلا مہتاب
ذہن نے کھولی رُکتے رُکتے ماضی کی پارینہ کتاب
یادوں کے بے معنی دفتر ' خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب!
گزری بات صدی یا پل ہو' گزری بات ہے نقش برآب

یہ روداد ہے اپنے سفر کی ' اس آباد خرابے میں
دیکھو ! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

شہر تمنا کے مرکز میں لگا ہوا ہے میلا سا
کھیل کھلونوں کا ہر سو ہے اک رنگیں گلزار کھلا
وہ اک بالک جس کو گھر سے اک درہم بھی نہیں ملا
میلے کی سج دھج میں کھوکر باپ کی انگلی چھوڑ گیا
ہوش آیا تو خود کو تنہا پاکے بہت حیران ہوا

بھیڑ میں راہ ملی نہیں گھر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ! ہم نے کیسے بسر کی ' اس آباد خرابے میں

وہ بالک ہے آج بھی حیراں' میلا جوں کا توں ہے لگا
حیراں ہے بازار میں چُپ چُپ 'کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت ' کہیں نجابت ' کہیں محبت ' کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے ' کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے آخر اس احمق کو اسی تذبذب میں چھوڑا

اور نکالی راہ مفر کی ' اس آباد خرابے میں
دیکھو ! ہم نے کیسے بسر کی ' اس آباد خرابے میں

ہونٹ تبسم کے عادی ہیں' ورنہ روح ہیں زہر آگیں
گھپے ہوئے ہیں اتنے نشتر ' جن کی کوئی تعداد نہیں
کتنی بار ہوئی ہے ہم پر تنگ یہ پھیلی ہوئی زمیں
جس پر ناز ہے ہم کو اتنا ' جھکی ہے اکثر وہی جبیں
کبھی کوئی سفلہ آتا ہے ' کبھی کوئی ابلہ فرزیں

بیچی لاج بھی اپنے ہنر کی ' اس آباد خرابے میں
دیکھو ! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

کالے کوس غم الفت کے ' اور میں نانِ شبینہ جو
کبھی چمن زاروں میں الجھا ' اور کبھی گندم کی بو
نافۂ مشکِ تتاری بن کر لیے پھری مجھ کو ہر سو
یہی حیاتِ صاعقۂ فطرت ' بنی تعطّل ' کبھی نمو
کبھی کیارم عشق سے ایسے ' جیسے کوئی وحشی آہو
اور کبھی مر مر کے سحر کی ' اس آباد خرابے میں
دیکھو ! ہم نے کیسے بسر کی ' اس آباد خرابے میں

کبھی غنیم جور و ستم کے ہاتھوں کھائی ایسی مات
ارض الم میں خوار ہوئے ہم' بگڑے رہے برسوں حالات
اور کبھی جب دن نکلا ' تو بیت گئے جُگ ' ہوئی نہ رات
ہر سو مہہ وش سادہ قاتل' لطف و عنایات کی سوغات
شبم ایسی ٹھنڈی نگاہیں ' پھولوں کی مہکار سی بات
ملی خلشِ پر زخم جگر کی ' اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی ' اس آباد خرابے میں

خوار ہوئے دمڑی کے پیچھے اور کبھی جھولی بھر مال
ایسے چھوڑ کے اٹھے جیسے چھوا تو کردے گا کنگال
سیانے بن کر بات بگاڑی ٹھیک پڑی سادہ سی چال
چھانا دشتِ محبت کتنا آبلہ پا مجنوں کی مثال
کبھی سکندر ' کبھی قلندر ' کبھی بگولا ' کبھی خیال
سوانگ رچائے اور گزر کی ' اس آباد خرابے میں
دیکھو ! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

زیست خدا جانے ہے کیا شے ؟ بھوک' تجسس رشک فرار
پھول سے بچے ' زُہرہ جبینیں ' مرد مجسم باغ و بہار
مرجھا جاتے ہیں ؟ کون ہے وہ جس نے بیمار
کیا ہے روحِ ارض کو آخر ؟ اور یہ زہریلے افکار
کس مٹی سے اُگتے ہیں سب' جینا کیوں ہے اک بیگار
ان باتوں سے قطع نظر کی ' اس آباد خرابے میں
دیکھو ! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

اور کہیں وہ کویل کوکی، رات کے سناٹے میں دور
کچی زمیں پر بکھرا ہوگا آم کا مہکا مہکا بور
بار مشقت کم کرنے کو کھلیانوں میں کام سے چور
کم سن لڑکے گاتے ہوں گے، لو دیکھو وہ صبح کا نور
چاہِ شب سے پھوٹ کے نکلا، میں مغموم کبھی مسرور
جوں توں یہ منزل بھی سر کی، اس آباد خرابے میں
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

راہ نوردِ شوق کورہ میں کیسے کیسے یار ملے
ابر بہاراں، عکسِ نگاراں، خالِ رخِ دلدار ملے
کچھ بالکل مٹی کے مادھو، کچھ خنجر کی دھار ملے
کچھ منجدھار میں، کچھ ساحل پر، کچھ دریا کے پار ملے
ہم سب سے ہر حال میں لیکن یوں ہی ہاتھ پسار ملے
صرف ان کی خوبی پہ نظر کی، اس آباد خرابے میں
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

ساری ہے بے ربط کہانی، دھندلے دھندلے ہیں اوراق
کہاں ہیں وہ سب؟ جن سے تھی پل بھر کی دوری بھی شاق
کہیں کوئی ناسور نہیں، گو حائل ہے برسوں کا فراق
کرم فراموشی نے دیکھو! چاٹ لیے کتنے میثاق
وہ بھی ہم کو رو بیٹھے ہیں، چلو ہوا قرضہ بے باق
کھلی تو آخر بات اثر کی، اس آباد خرابے میں
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

خواب تھے اک دن اوج زمیں سے کاہکشاں کو چھولیں گے
کھیلیں گے گل رنگ شفق سے، قوس قزح میں جھولیں گے
باد بہاری بن کے چلیں گے، سرسوں بن کر پھولیں گے
خوشیوں کے رنگیں جھرمٹ میں رنج و محن سب بھولیں گے
داغ گل و غنچہ کے بدلے مہکی ہوئی خوش بو لیں گے
سوچ رہا ہوں ادھر ادھر کی، اس آباد خرابے میں
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب!
گزری بات صدی یا پل ہو، گزری بات ہے نقش بر آب
مستقبل کی سوچ ، اٹھا یہ ماضی کی پارینہ کتاب
منزل ہے یہ ہوش و خبر کی ، اس آباد خرابے میں
دیکھو ! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

'یادیں' اختر الایمان کی شاعری کا' کہا جاسکتا ہے کہ مرکزی خیال ہے۔ان کے ہاں ایسی نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں یادوں کی رنگا رنگی' اور زندگی پائی جاتی ہے۔اسی بارے میں آپ 'اختر الایمان کی نظم نگاری' کے تحت بھی پڑھ چکے ہیں اور ان کی نظم ''ایک لڑکا'' کی تشریح کرتے ہوئے بھی ہم نے اس تعلق سے بتایا۔ابھی آپ نے اختر الایمان کی نظم ''یادیں'' بھی پڑھی۔اب ہم اسی نظم کی تشریح پیش کریں گے۔یہ نظم تو ازابتدا تا انتہا یادوں پر مشتمل ہے۔شاعر اپنی عمر کی ایک منزل پر پہنچ چکا ہے اور اس مرحلہ پر آتے آتے اس نے بہت کچھ سنا' دیکھا' پایا' کھویا' سہا' برتا اور اس آباد خرابے میں تماشا بھی بنا اور تماشائی بھی۔اب وہ گزری ہوئی زندگی پر سوچتا ہے تو کئی چیزیں شیشہ ذہن پر ابھر آئی ہیں۔فلم کی طرح منظر بدلتے جاتے ہیں۔شاعر جانتا ہے کہ یادوں کے یہ یہ بے معنی دفتر ہیں اور گزری ہوئی باتیں نقش بر آب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

میلے کی سیر ہے' کھیل کھلونے ہیں ان کی سج دھج دیکھنے کے لائق ہے۔لیکن جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں وہ اپنے باپ سے بچھڑ جاتا ہے اور جب دیکھتا ہے تو چپ اور حیران ہو جاتا ہے کہ بازار میں کیا کچھ نہیں بکتا' شرافت' نجابت' محبت' وفا' اولاد' حتی کہ خدا بھی۔حد تو یہ ہے کہ لوگ اپنے ہنر کی لاج بھی بیچنے پر مجبور ہیں۔وہ اپنے آپ میں کھویا ہوا' کبھی روٹی کی تلاش' غم روزگار تو کبھی غم عشق' کبھی دشمنوں سے مات کھائی تو کبھی غم زمانہ کا چکر رہا۔مہہ وش بھی سادہ قاتل بن کر شبنم جیسی ٹھنڈی نگاہیں اور پھولوں کی مہکار سی باتیں کرتے ہوئے لیکن زخم جگر پر خلش ہی ملی۔یادیں ابھر ابھر آتی ہیں۔نیرنگی زمانہ نے بھی کیا کیا رنج نہیں دکھائے۔کبھی جھولی بھری رہی تو کبھی کنگال کی طرح خالی۔کبھی مجنوں کی طرح دشت نوردی کی تو کبھی سکندر کبھی قلندر بنے۔کبھی بگولا۔ بہر کیف سوانگ رچاتے زندگی گزری..... یہاں نظم میں ہلکا سا ایک موڑ آتا ہے۔یادیں نیا منظر سامنے لاتی ہیں۔پھول سے بچے زہرہ جبیں محبوب اور باغ و بہار کی طرح مرد آخر کیوں مرجھاتے ہیں۔وہ کون ہے جس سے روح ارضی بیمار محسوس ہوتی ہے۔یہ زہریلے افکار آخر کہاں سے آتے ہیں؟ ان ساری باتوں سے بے پروا' اس آباد خرابے میں زندگی کرنی ہے۔اور ایسے میں جب کوئل کوکتی ہے تو شاعر سوچتا ہے کہیں آم کا بور بکھرا ہوگا۔کم سن لڑکے اپنی تھکن کو کم کرنے گا رہے ہوں گے' صبح کی سپیدی پھیلی ہوگی لیکن کیا کہ اس بھری دنیا میں غم بھی ہے اور مسرت بھی اور زندگی یونہی گزارنی ہے۔یہ راہ حیات ہے یہاں اچھے برے سب ملتے ہیں۔دلدار بھی احمق بھی لیکن ہم نے زمانے کی خرابیوں سے صرف نظر کیا' صرف اچھائیوں کو دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ زندگی بڑی سنگدل ہے۔جن سے پل دو پل کی دوری بھی شاق گزرتی تھی۔اب ان سے برسوں کی جدائی گوارا کرنی ہے۔شاعر کہتا ہے ہم نے بھی کیا کچھ خواب نہیں دیکھے تھے۔کہکشاں کو چھونے کے' قوس قزح میں جھولنے کے' باد بہاری بن کر چلنے کے اور سرسوں بن کر پھولنے کے۔لیکن یہ سب ادھر ادھر باتیں رہیں۔

شاعر آخر میں پھر یہی محسوس کرتا ہے کہ یہ گزری ہوئی باتیں نقش بر آب سے بڑھ کر نہیں۔اس ہوش و خرد کی دنیا میں ایسی باتوں کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ یادیں' ماضی کی یہ کتاب بھولا بسرا قصہ ہے۔اس آباد خرابے میں اس کا کیا مقام!

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظم ''یادیں'' کو اختر الایمان کی شاعری کا مرکزی خیال کیوں کہا جاتا ہے؟
2. میلے کی سیر میں شاعر نے کیا کیا دیکھا؟
3. اس نظم کے آخری حصے میں شاعر کیا سوچتا ہے؟

28.4.3 سرراہ گزارے

شب ماہ تو ہے، سحر بھی تو
کہ فغاں بھی تو ہے اثر بھی تو
یہ تری بہار کے دن سہی
یہ ترے نکھار کے دن سہی
نہ مٹا کسی کو سنبھل سنبھل
سرِ راہ یوں نہ بہک کے چل
کہ زمیں پہ رہتے ہیں اور بھی
جنھیں حسن سے بھی لگاؤ ہے
جنھیں زندگی بھی عزیز ہے

اختر الایمان نے مختصر نظمیں بھی کہی ہیں۔ان کی بعض مختصر نظمیں تو بڑی عمدہ ہیں۔اس مختصر سی نظم ''سرراہ گزرے'' میں وہ محبوب کے تجاہل و تغافل'' بے نیازی اور ناز و انداز کے ہلکے سے پرتو کو پیش کرتے ہیں۔اختر الایمان کہتے ہیں کہ محبوب شب ماہ بھی ہے اور سحر بھی' فغاں بھی' فغاں کا اثر بھی۔یہ محبوب کے اوج و شباب کا زمانہ سہی' بہار و نکھار کے دن سہی' لیکن محبوب اتنا نہ اٹھلائے' اتنا نہ بہک کے چلے' کچھ تو سنبھلے کہ یہاں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جنھیں محبوب سے پیار ہے۔اس کے حسن سے لگاؤ ہے لیکن جنھیں اپنی زندگی بھی عزیز ہے جو محبوب پر مر مٹنے کے لیے جینا چاہتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. نظم ''سرراہ گزارنے'' کا خلاصہ لکھیے۔
2. اس نظم میں شاعر نے محبوب کی تعریف کس طرح کی ہے؟

28.5 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے آپ کو اختر الایمان کی زندگی اور ان کی نظم نگاری کے بارے میں بتایا۔آپ نے اس اکائی کے خاکے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔اختر الایمان اپنی زندگی میں جن نشیب و فراز سے گزرے ان سے بھی آپ نے واقفیت حاصل کی۔اور ان کی شاعری سے بھی تفصیلی طور پر آپ نے آگہی حاصل کی۔آپ نے اختر الایمان کی تین نظمیں اور ان تینوں نظموں کی تشریح پڑھی۔اس سے بھی اختر الایمان کی زندگی اور شاعری کو سمجھنے میں آپ کو مدد ملی۔آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔آخر میں امتحانی سوالات بھی دیے جا رہے ہیں اور فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی۔سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جا رہی ہے۔

28.6 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. اختر الایمان کے حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔
2. اختر الایمان کی شاعری کی خصوصیات تفصیل سے لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' کی تشریح کیجیے۔
2. اختر الایمان کی نظم ''یادیں'' کا جائزہ لیجیے۔

28.7 فرہنگ

الفاظ	=	معنی
دیار	=	شہر، علاقہ، ملک
تعاقب	=	پیچھے جانا، پیچھا کرنا
سیلانی	=	سیر کرنے والا
گام	=	قدم
افلاک	=	فلک کی جمع، آسماں
تونگر	=	دولت مند، امیر، مالدار
ذہن رسا	=	اعلیٰ دماغ
تحصیل	=	حاصل کرنا
اندوہ	=	رنج وغم
خاشاک	=	کوڑا کرکٹ
چاہ	=	کنواں
بالک	=	لڑکا
سفلہ	=	کمینہ، نالائق
سوغات	=	تحفہ
مشقت	=	محنت

الفاظ	=	معنی
کرم	=	کیڑے
پیچاں بگولہ ساں	=	بگولہ کی طرح پیچیدہ
تند	=	تیز
مفرور	=	جو فرار ہو گیا ہو
اسفل	=	نہایت نیچا۔ انتہائی ذلیل
ہنرہ کار	=	لغو، بے ہودہ کام کرنے والا
خروش	=	شور
آبلہ	=	چھالا
اضطراب آسا	=	بے چین جیسا
کذب	=	جھوٹ
پارینہ	=	قدیم، پرانی
نجابت	=	شرافت، اصالت
صاعقہ	=	کڑکنے والی بجلی
زیست	=	زندگی
راہ نورد	=	راستہ چلنے والا

الفاظ	=	معنی
کم سن	=	کم عمر
آوارہ منش	=	آوارہ مزاج
ہم زاد	=	جو ساتھ پیدا ہوا ہو
معترف	=	اقرار کرنے والا
نکبت	=	مفلسی، بدحالی
دریوزہ گر	=	فقیر، بھکاری
اتمام	=	اختتام، انجام
آشفتہ	=	پریشان
لحد	=	قبر
افترا	=	الزام
نقش پر آب	=	جلد مٹ جانے والا
تذبذب	=	شک وشبہ
غنیم	=	دشمن
بیگار	=	اجرت کے بغیر کام لینا
منجدھار	=	دریا کا وسط

28.8 سفارش کردہ کتابیں

1. شاہد ماہلی — اختر الایمان، عکس وجہتیں
2. اختر الایمان — اس آباد خرابہ میں

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

نصاب

ایم اے اُردو (فاصلاتی تعلیم)

سال اول :

پہلا پرچہ غزل، قصیدہ اور رباعی

دوسرا پرچہ مثنوی، مرثیہ اور نظم

تیسرا پرچہ اردو زبان و ادب کی تاریخ

چوتھا پرچہ فارسی اور ہندی

سال دوم :

پانچواں پرچہ ادبی تنقید

چھٹا پرچہ ترجمہ نگاری اور ابلاغیات

ساتواں پرچہ داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما

آٹھواں پرچہ غیر افسانوی ادب (خاکہ نگاری/انشائیہ سوانح/خطوط نویسی/طنز و مزاح)

دوسرا پرچہ : مثنوی، مرثیہ اور نظم

حصہ اول

اکائی 1 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا آغاز و ارتقا

اکائی 2 دکن میں اردو مثنوی کا آغاز و ارتقا

اکائی 3 مثنوی کا فن، ادبی اور تہذیبی اہمیت

اکائی 4 غواصی، حیات، ادبی کارنامے اور سیف الملوک و بدیع الجمال کا جائزہ

اکائی 5 میر حسن، حیات، ادبی کارنامے اور سحر البیان کا خصوصی مطالعہ

اکائی 6 پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" کا اجمالی جائزہ

اکائی 7 شوق، حیات و کارنامے اور مثنوی زہر عشق کا جائزہ

اکائی 8 اُردو مرثیہ کا آغاز و ارتقا

اکائی 9 مرثیہ کا فن، ادبی اور تہذیبی اہمیت، مقبولیت کے اسباب

اکائی 10 انیس: حیات، مرثیہ نگاری میں ان کا مقام، شامل نصاب مرثیے کا تجزیہ

اکائی 11 دبیر: حیات، مرثیہ نگاری میں ان کا مقام، شامل نصاب مرثیے کا تجزیہ

اکائی 12 وحید اختر کی مرثیہ نگاری

اکائی 13 مراثی انیس و دبیر کا تقابلی مطالعہ

حصہ دوم

اکائی 14 اردو نظم کا آغاز و ارتقا

اکائی 15 دکن میں نظم نگاری

اکائی 16 شمالی ہند میں نظم نگاری

اکائی 17 نظم کی مختلف ہیئتیں

اکائی 18 ترقی پسند تحریک اور نظم نگاری

اکائی 19 حلقہ ارباب ذوق کی نظم نگاری

اکائی 20 سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ حیات اور نظم نگاری

اکائی 21 نظیر اکبر آبادی۔ حیات، شخصیت، کارنامے اور نظم نگاری

اکائی 22 مولانا حالی۔ حیات، شخصیت، کارنامے اور نظم نگاری

اکائی 23 اقبال: حیات، کارنامے اور نظم نگاری

اکائی 24 اختر شیرانی۔ حیات، کارنامے اور نظم نگاری کی خصوصیات

اکائی 25 جوش ملیح آبادی۔ حیات اور نظم نگاری

اکائی 26 فیض: حیات، کارنامے اور نظم نگاری

اکائی 27 مخدوم: حیات، کارنامے، نظم نگاری کی خصوصیات

اکائی 28 اختر الایمان: حیات، نظم نگاری کی خصوصیات